نمازِ جعفریہ

قرآن و حدیث کی روشنی میں

حضرت علامہ محمد حسن جعفری

نمازِ جعفریہ

قرآن و حدیث کی روشنی میں

تالیف

حضرت علامہ محمد حسن جعفری مدظلہ العالی

ناشر

اِدارہ مِنہاجُ الصّالحین

الحمد مارکیٹ فسٹ فلور دکان نمبر 20 - غزنی سٹریٹ - اُردو بازار - لاہور

فون: 042-37225252 • 0301-4575120

کتاب: نماز جعفریہ قرآن و حدیث کی روشنی میں

مولف: علامہ محمد حسن جعفری

پروف ریڈنگ: محمد عمران چودھری

تعداد: 1000

اشاعت: اپریل 2017

صفحات: 192

ہدیہ: 200

ملنے کا پتہ

ادارہ منہاج الصالحین۔ لاہور

الحمد مارکیٹ فسٹ فلور دکان نمبر 20۔ غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار۔ لاہور

فون: 042-37225252 ، 0301-4575120

maablib.org

ترتیب

✵......عرض ناشر	8
✵......اہمیت نماز	11
باب اول: وضو	17
✵......مکتب خلافت کا استدلال	19
✵......ابن عباسؓ کا نظریہ	21
✵......تفسیر ابن کثیر اور پاؤں کا مسح	22
✵......آیت تیمم	26
✵......حکم قرآن اور عمل رسولؐ	28
✵......عمل اہل بیتؑ	31
باب دوم: اذان	33
✵......حَيَّ عَلٰی خَيْرِ الْعَمَلِ	39
✵......اَلصَّلٰوۃُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ	42
✵......تثویب قابل نفرت عمل ہے	45
✵......حَيَّ عَلٰی خَيْرِ الْعَمَلِ اور الصَّلٰوۃُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کا معنوی فرق	47
✵......اذان کا آخری جملہ	48
باب سوم: کیا بسملہ سورت کا حصہ ہے؟	50

باب چہارم: نماز میں ہاتھ کھولنا اور باندھنا 63
❁......ہاتھ باندھنے پر اصرار کیوں؟ 68
❁......کیا ہاتھ باندھنے کی روایت صحیح ہے؟ 73
❁......ہاتھ کھول کر نماز پڑھنے والے 88
❁......تابعین عظام 91
❁......تبع تابعین 91
❁......ائمہ اہل بیتؑ کا قول وفعل 92
❁......رسولؐ خدا کی قولی اور ابوحمید ساعدی کی فعلی حدیث 93
❁......ابوحمید ساعدی کی اصولی وفعلی حدیث 95
❁......حدیث پر مختصر تبصرہ 99
❁......حدیث کی اہمیت 100
❁......دس صحابہ کرام کی تصدیق 100
❁......اکثریتی فیصلہ اور اقلیتی فیصلہ 102
باب پنجم: رفع یدین 106
❁......ائمہ حدیث اور رفع یدین 109
❁......حضرت علیؑ کا طرز عمل 110
❁......امام سجادؑ کی بیان کردہ روایت 110
❁......حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کا طرز عمل 111
❁......صحابہ کرام کا طرز عمل 111
❁......رفع یدین از نظر علمائے اہل تسنن 113
❁......وہ احادیث جن سے رفع یدین کی نفی ہوتی ہے 114

باب ششم: قنوت 118

❁......تمام نمازوں میں قنوت کا پڑھا جانا 121

❁......قنوت رکوع سے پہلے یا بعد میں؟ 123

❁......صحابہ کرام کا عمل 125

❁......ائمہ اہل بیتؑ اور قنوت 125

❁......قنوت چھوڑنے کی وجہ 126

باب ہفتم: سجدہ میں جانے کے دو طریقے 128

❁......ائمہ اربعہ 129

❁......پہلے طریقہ کا استدلال اور اس کا ضعف 129

❁......① عاصم بن کلیب: 130

❁......② شریک: 131

❁......سجدہ میں جانے کا دوسرا طریقہ 133

❁......پہلی قولی حدیث 133

❁......دوسری قولی حدیث 133

❁......آنحضرت کا عمل 134

❁......صحابہ کرام کا عمل 134

❁......اہل بیتؑ کا عمل 135

❁......امام مالک اور ائمہ حدیث 136

باب ہشتم: ذکرِ رکوع و سجود 137

❁......قرآنی آیات 137

❊......عملِ رسولؐ 139

❊......اہلِ سنت کی اختلافی روایات اور ان کی حقیقت 141

❊......ذکر رکوع و سجود کے متعلق ائمہ اہلِ بیتؑ کا فتویٰ 143

باب نہم: سجدہ کس پر کرنا چاہیے؟ 145

❊......روایت کا تجزیہ 146

❊......خُمرہ پر سجدہ 149

❊......خُمرہ کیا ہے؟ 150

❊......ائمہ اہلِ بیتؑ کا فرمان 152

❊......سجدہ کی حکمت 152

باب دہم: دوسرے سجدہ کے بعد کیسے اُٹھنا چاہیے؟ 154

❊...... پہلے طریقے کی حدیث اور اس کا علمی جائزہ 154

❊......دعوتِ انصاف 158

❊......دوسرے طریقے کی حدیث 158

❊......ایک عالم کا اعتراف 160

❊......ائمہ اہلِ بیتؑ کا طریقہ 160

باب یازدہم: تشہد و سلام 161

❊......ائمہ اربعہ اور تشہد 161

❊......فرض اور واجب کا فرق 162

❊......ائمہ اہلِ بیتؑ اور تشہد 162

❊......درود اور ائمہ اربعہ 163

❖......درود کے لیے رسولؐ خدا کا فرمان	163
❖......تشہد میں درود اور صحابہ کرام اور تابعین	164
❖......سلام	164
❖......سلام مختلف قسموں میں	165
❖......اب سوال یہ ہے؟	166
باب دوازدہم: جمع بین الصلاتین	169
❖......اوقاتِ نماز اور قرآن	170
❖......آیتِ مجیدہ کی تفسیر	170
❖......جمع الصلاۃ اور سنتِ رسولؐ	174
❖......عملِ صحابہ	177
❖......علامہ وحید الزمان کا اعتراف	179
باب سیزدہم: نمازِ جنازہ	184
❖......سُنّی نمازِ جنازہ	184
❖......شیعہ نمازِ جنازہ	187
❖......پانچ تکبیرات اور کتبِ اہلِ سنت	190
❖......چار تکبیرات کب سے رائج ہوئیں؟	191
❖......تکبیراتِ جنازہ اور ائمہ اہلِ بیتؑ	192

❖❖❖

عرض ناشر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد اُمت اسلامیہ دو حصوں میں تقسیم ہوگئی: ایک نے اپنا مرکز ومحور اہلِ بیتؑ رسول کو قرار دیا، اور ان سے دین حاصل کیا۔ جب بھی کوئی مشکل پیش آئی، درِ عصمت پر دستک دی، اور اپنے مسائل کا حل تلاش کیا۔ اس نظریہ کے حامل لوگوں کو مکتبِ امامت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس مکتب کے پیرو اہلِ بیتؑ کے گھر سے ہی مربوط رہے، کسی اور کی طرف نگاہ نہیں اٹھائی۔

یہ ایک ایسا خوش قسمت مکتب ہے کہ جس نے مولائے کائناتؑ سے لے کر مہدیؑ برحق تک ہر امامِ زمانؑ کو حجتِ خدا مانا، اور انھیں جانشین رسولؐ گردانا۔ یہ عصمت کی مربوط کڑیاں ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی کرم خوردہ نہیں۔ ان میں کسی کو شرک وکفر کی آلودگی سے متصور نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اللہ کے نبی کے پاک وپاکیزہ جانشین ہیں، ان کی رگوں میں پاک نبیؐ کا خون ہے۔ یہ نبیؐ کے سچے اور کھرے نمائندے ہیں۔

دوسرا مکتبِ خلافت ہے جس کی اپنی سوچ، اپنا نظریہ اور اپنے اُصول ہیں۔ نبیٔ رحمت کی رحلت کے بعد انھوں نے کوئی مستقل اصول وضع نہیں کیا جس کی روشنی میں ہم افراد کو دیکھ سکتے۔ ہر ایک شخص پر ایک علیحدہ اصول اپنایا گیا ہے۔ پہلی خلافت میں ہمیں مدینہ منورہ میں کچھ افراد کے اجتماع کا فیصلہ نظر آتا ہے۔ دوسری

خلافت میں تعیین شخصی نظر آتا ہے، تیسری خلافت میں چھ افراد کی کمیٹی دکھائی دیتی ہے۔ چوتھی خلافت میں لوگوں کا رجوع نظر آتا ہے اور پھر خلیفۂ اقتدار پر متمکن ہوتے ہی یہ اعلان کرتے ہوئے نظر آتا ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِی رَجَعَ الْحَقُّ اِلٰی اَھْلِہٖ

"شکر ہے خدا کا کہ آج حق اپنے اہل کے پاس آگیا"۔

اور پھر چوتھی خلافت کے خلاف شام کا گورنر بغاوت کا اعلان کر دیتا ہے، اور پھر جنگ برپا ہو جاتی ہے اور آخر میں ہم چوتھی خلافت کے باغی کو بھی جانشینِ رسولؐ بنا دیتے ہیں اور پھر یہ اپنے بیٹے زانی، شرابی، عیاش، بدکار، تارکِ نماز کو مسلمانوں کا خلیفہ بنا دیتا ہے۔ ہم اس کے سامنے بھی سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ پھر جا کر ہمیں سمجھ نہیں آتی —— امام کون بنا؟ کس نے بنایا؟ —— فقہ و اجتہاد کا امام کس طرح بنا —— جانشینیِ رسولؐ کہاں چلی گئی؟ اچھے بُرے خلیفہ کی پہچان و معیار کیا ہے؟ بنی اُمیہ و بنی عباس کے خلفاء کو ہم نے کس مقام پر متمکن کیا؟ ان کا مِلاک کیا ہے؟ ان سے دین لیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ یہ جانشینِ رسولؐ تھے یا دنیاوی بادشاہ؟ آیا ان سے لیے ہوئے دین کی حیثیت کیا ہوگی؟ یہ سارے سوالات پیدا ہوتے ہیں؟؟

زیرِ نظر کتاب "نمازِ رسولؐ" میں ان مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اُمت اسلامیہ آج تک اتفاق و اتحاد نہ کر سکی کہ رسولؐ نے وضو کیسے کیا؟ آپؐ پاؤں اور سر کا مسح کرتے تھے یا دھوتے تھے؟ رفع یدین کرتے تھے یا نہیں؟ نماز ہاتھ کھول کر پڑھتے تھے یا باندھ کر؟ وغیرہ وغیرہ۔

ان مسائل کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مکتب اہلِ بیتؑ والے تو فقط خاندانِ عصمتؑ سے مربوط رہے، کسی اور گھر کی طرف جھانک کر تو دیکھا ہی نہیں۔ ہمیشہ

وحیِ الٰہی کے تابع رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو احکام امیر کائناتؑ نے بیان کیے وہی مہدیٔ برحقؑ نے بیان فرمائے۔ جب کہ دوسری طرف نظریۂ ضرورت غالب رہا۔ کسی ایک اصول کی پاسداری نہ کی گئی، بلکہ بہت سارے مسائل میں متضاد افکار پائے جاتے ہیں۔

ہمارے قارئین کرام کو ان موضوعات پر تعصب کی عینک اُتار کر تحقیق کرنی چاہیے اور مسئلہ کی گہرائی تک پہنچنا چاہیے۔

ہم مشکور ہیں جناب علامہ محمد حسن جعفری صاحب کے کہ جنھوں نے عرق ریزی کے ساتھ اس حساس موضوع پر قلم اُٹھایا اور دلائل و براہین کی روشنی میں پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ دعا ہے کہ معصومۂ کائناتؑ آپ کو اس کا اجرِ جزیل عطا فرمائے اور آپ کی اس کاوش کو اپنی بارگاہِ عالیہ میں قبول فرمائے۔

والسلام مع الاکرام

طالبِ دُعا!

ریاض حسین جعفری فاضل قم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اہمیّت نماز

روز محشر کہ جانگداز بود

اولین پرسش نماز بود

الحمد للہ رب العالمین الصلاۃ والسلام علی رسول الکریم واھل بیتہ الطاھرین...... امابعد!

نماز دین اسلام کا اہم ترین رکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیسیوں مقامات پر اس کی ادائیگی کا حکم دیا ہے اور ترک نماز کی سخت مذمت کی ہے۔

حضرت حبیب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ آپؐ نے فرمایا: نماز ہی مسلم اور کافر کے درمیان حدِ فاصل ہے۔

آپ کا فرمان ہے: اگر نماز قبول ہوگئی تو باقی اعمال بھی قبول ہو جائیں گے اور اگر نماز ہی رد ہوگئی تو باقی اعمال بھی رد کر دیے جائیں گے۔

قرآن حکیم میں تارکِ صلاۃ کو مشرکین کی ردیف میں شامل کیا گیا ہے اور سورۂ مدثر کے مطابق جب اہلِ جنت اہلِ نار سے اُن کے جرائم دریافت کریں گے تو وہ اپنا پہلا جرم یہی بیان کریں گے کہ ہم نمازیوں میں سے نہیں تھے۔

قرآن مجید میں بیسیوں ایسی آیات موجود ہیں جن میں نماز کو مومنین کی فلاح اور نجات کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ البتہ نماز کے لیے ضروری شرط یہ ہے کہ نماز

اخلاصِ قلب کے ساتھ ادا کی جائے اور نماز کی ادائیگی میں ریاکاری کا عنصر شامل نہ ہو۔

قبولیتِ نماز کی بنیادی شرط یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے بیان کردہ طریقہ اور آپؐ کے عمل کے مطابق نماز ادا کی جائے۔ ہمیں نہایت افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیئیس برس تک لوگوں کو دکھا کر نماز پڑھائی تھی اور اگر ہم اس میں سے مکی زندگی کے تیرہ سالوں کو حذف بھی کر دیں اور صرف مدنی زندگی پر نظر کریں تو آپؐ نے پورے دس سال تک سفر اور حضر میں نماز جماعت کے ساتھ کرائی تھی۔ ایک دن آپؐ نے نمازِ پنجگانہ کی امامت کرائی اور عام طور پر مہینے میں تیس دن ہوتے ہیں تو اس لحاظ سے آپؐ نے ڈیڑھ سو مرتبہ جماعت کرائی اور ایک سال بارہ مہینوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس طرح سے آپؐ نے ایک سال میں اٹھارہ سو مرتبہ لوگوں کو نماز پڑھائی اور پھر جب ہم آپؐ کے دس سالوں پر نظر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آقائے نامدار نے اٹھارہ ہزار مرتبہ نماز پڑھائی تھی۔ مگر آپؐ کے کلمہ پڑھنے والوں کا آج تک نماز میں ہی اختلاف ہے۔ جب اُمت آنحضرتؐ کے اٹھارہ ہزار بار کیے جانے والے عمل کو محفوظ نہ رکھ سکی تو اُنھوں نے باقی اعمال کو کیا یاد رکھا ہوگا؟!

مسلمانوں میں نماز کی ادائیگی کے متعلق شدید اختلاف پایا جاتا ہے، اور یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ سارے طریقے ہی صحیح ہیں، کیونکہ یہ بات ناممکن ہے کہ آنحضرتؐ نے کچھ دن تک رفع یدین کیا ہو، پھر چھوڑ دیا ہو۔ اسی طرح سے یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ آپؐ نے چند سال ہاتھ باندھ کر نماز پڑھی ہو، پھر کھول کر پڑھنی شروع کر دی ہو۔ اور نماز میں ہاتھ باندھنے کے بھی مختلف طریقے ہیں۔ آنحضرتؐ کے متعلق یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ آپؐ نے کچھ سال زیرِ ناف ہاتھ باندھے تھے

اور بعدازاں سینے پر ہاتھ باندھنے لگے تھے یا آپؐ نے کوکھ پر ہاتھ رکھ کر نماز پڑھی ہوگی۔

اسی طرح وضو کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ حبیبؐ خدا نے کچھ دنوں تک پاؤں کا مسح کیا ہوگا اور بعدازاں آپؐ نے دھونا شروع کر دیا ہوگا۔

نماز اور وضو کے لیے آپؐ کا جو بھی طریقہ تھا وہ ایک ہی تھا۔ آپؐ نے مختلف طریقوں پر عمل نہیں کیا تھا۔ چنانچہ نماز اور وضو کے لیے ایک ہی طریقہ صحیح ہے۔ مختلف طریقے صحیح نہیں ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کے اس عمل میں آخر اختلاف کیوں پیدا کر دیا گیا؟ اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد عملِ پیغمبر کو دو طبقات نے بیان کیا تھا۔ ایک طبقہ کو اہلِ بیتؑ کہا جاتا ہے اور دوسرے طبقہ کو صحابہ کہا جاتا ہے۔ اب جو بھی غلطی ہوئی اس کا الزام ان دو میں سے کسی نہ کسی گروہ پر ضرور عائد ہوتا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ تعلیماتِ پیغمبرؐ میں آئمہ اہلِ بیتؑ نے تحریف کی تھی تو اس کا یہ مفروضہ بالبداہت باطل ہے، کیونکہ اہلِ بیتؑ کی تطہیر کی گواہی قرآن مجید یہ کہہ کر دیتا ہے:

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ۝ (سورۂ احزاب، آیت ۳۳)

"اے اہلِ بیتؑ! اللہ کا تو بس یہی ارادہ ہے کہ وہ تم سے ہر طرح کی ناپاکی کو دُور رکھے اور تمھیں ایسی پاکیزگی دے جیسا کہ پاکیزگی کا حق ہے"۔

لہٰذا یہ الزام اہلِ بیتؑ پر تو عائد نہیں کیا جا سکتا اور جہاں تک صحابہ کرام کی بات ہے تو اُن کے لیے قرآن مجید میں طہارت کی کوئی گواہی موجود نہیں ہے۔ باایں ہمہ صحابہ کرام میں آنحضرتؐ کے اعلیٰ درجہ کے وفادار صحابی بھی موجود تھے۔ ہم یہ الزام ان پر عائد کر کے کسی طرح کے سوءِ ظن کے مرتکب نہیں ہونا چاہتے۔ البتہ صحابہ کی جماعت میں کچھ حکومتِ وقت کے ہمدرد افراد بھی موجود تھے، جنھوں نے ہر موقع و مقام پر حکومتِ وقت کے نظریات کی تصدیق کی تھی اور اس کے لیے جھوٹی احادیث اختراع کی تھیں۔ چنانچہ ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے دین کا چہرہ مسخ ہوا، اور اُمت گروہوں میں تقسیم ہوئی اور اُمت اسلامیہ کسی ایک عمل پر بھی متفق نہ رہی۔ حد یہ ہے کہ آج اُمت اس عمل پر بھی متفق نہیں ہے جسے آنحضرتؐ نے کم از کم اٹھارہ ہزار مرتبہ کر کے دکھایا تھا۔

بندہ نے نماز کے عنوان پر بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا اور اس مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ نمازِ پیغمبر تو ایک ہی تھی لیکن یار لوگوں نے اس میں خواہ مخواہ کی قطع و برید کی۔ چنانچہ یہ رسالہ اسی موضوع کے لیے لکھا گیا ہے۔ حوالہ جات نقل کرنے میں ہم نے پوری احتیاط سے کام لیا ہے۔ اگر اس کے باوجود قارئین کو کہیں کوئی کمی بیشی نظر آئے تو وہ ہمیں اپنی آراء سے مطلع فرمائیں۔ ہم ان کی آراء کا خیر مقدم کریں گے۔

بندہ کی خواہش تھی کہ نماز کے عنوان پر جو رسالہ لکھا جا رہا ہے اس میں پوری طرح سے کیفیت نماز کو لکھا جائے، لیکن بندہ نے محسوس کیا کہ اس سے رسالہ کا حجم کہیں زیادہ بڑھ جائے گا اور یوں یہ رسالہ کی بجائے ایک ضخیم کتاب کی شکل اختیار کر لے گا۔ اسی لیے بندہ نے اس میں کیفیتِ نماز کی بجائے اپنی بحث کو صرف

اختلافی مقامات تک ہی محدود رکھا ہے۔ اور پوری کتاب میں ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ اس میں کسی طرح کے فرقہ وارانہ تعصب کا اظہار نہ ہو۔ اور ہم نے یہ کتاب ان تمام مسلمانوں کے لیے لکھی ہے جو یہ چاہتے ہیں کہ ان کی نماز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز کے مطابق ہو۔

الغرض یہ کتاب کسی طرح کے چیلنج پر مشتمل نہیں ہے اور نہ ہی اس کا مقصد کسی مسلمان کی دل آزاری۔ ہم نے حتی المقدور حقائق سے پردہ اُٹھانے کی کوشش کی ہے۔ اور اس طرح سے ہم اپنے تمام بھائیوں کو دعوتِ تحقیق دینا چاہتے ہیں اور اس سے ہمارا اول و آخر ہدف بس یہی ہے کہ مسلمان اتباع رسول کریں اور ان کی نماز اتباع رسول کا عملی نمونہ ہونی چاہیے۔

اتباع رسولؐ ہی وہ نعمت ہے جس سے انسان خدا کا محبوب بندہ بن سکتا ہے۔ جیسا کہ فرمانِ خداوندی ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

"آپ کہہ دیں کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو تم خدا کے محبوب بن جاؤ گے اور خدا تمہارے گناہ بخش دے گا۔ اللہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے"۔ (سورہ آل عمران، آیت ۳۱)

ہم نے پوری غیر جانب داری اور دیانت کے تقاضوں کے تحت عالمِ اسلام کی مشہور اور مستند کتابوں سے حوالہ جات کو نقل کیا ہے اور قارئین سے بس یہی التماس ہے کہ وہ کھلے ذہن اور غیر جانب داری سے اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں اور

پھر صحیح اور باطل کا فیصلہ خود کریں۔ البتہ اس کے لیے فکری جمود اور تعصب سے دُور ہونا ضروری ہے۔

اس کتاب کی تالیف کے لیے جہاں ہم نے اور بہت سی کتابوں سے مدد حاصل کی ہے وہاں ہم نے فلك النجات فی الامامة والصلاة اور محترم مسعود نوازش کی کتاب حی علی صلواة الرسول اور محقق وحید سید غلام رضا شمسی کی کتاب صلاة المتقین سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔

آخر میں خداوند عالم کے حضور ملتمسِ دعا ہوں کہ وہ اس حقیری کوشش کو قبول فرمائے اور اسے ہماری بخشش کا ذریعہ بنائے اور ہمارے والدین کی بلندیِ درجات اور اُمت اسلامیہ کی اصلاح کا ذریعہ قرار دے۔

ہماری طرف سے حجۃ الاسلام والمسلمین ناشر حقائق دین، کشاف تعلیماتِ محمدؐ وآلِ محمدؐ علامہ ریاض حسین جعفری انتہائی تبریک کے لائق ہیں، جنھوں نے اس موضوع کے لیے ہماری حوصلہ افزائی فرمائی اور اسے اپنے ادارہ کی پالیسی کے مطابق بہترین انداز میں شائع کرایا۔

اللہ تعالیٰ ان کی توفیقاتِ خیر میں اضافہ فرمائے اور ان کے قائم کردہ ادارے کو حُرمتِ اہلِ بیتؑ کا پاسبان ہونے کا شرف عطا فرمائے۔

ع این دعا از من و از جملہ جہان آمین باد

والسلام علی من اتبع الهدیٰ

حررہ احقر الزمن: محمد حسن جعفری

باب اول

وضو

ہماری اس کتاب کا مقصد نماز اور اس کے متعلقات کے اختلافات پر تحقیق کرنا ہے۔ چند چیزیں نماز کے متعلقات اور مقدمات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مثلاً نمازی کا لباس پاک ہو، جہاں نماز پڑھ رہا ہے وہ جگہ غصبی نہ ہو، نمازی کا رُخ قبلہ کی طرف ہو اور نماز سے پہلے وضو اور غسل کر چکا ہو۔

جہاں تک پہلے مقدمات کا ذکر ہے تو اس میں مسلمانوں کے اندر کوئی اختلاف نہیں ہے، البتہ وضو کے متعلق مسلمانوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اسی لیے ہم اپنی تحقیق کا آغاز وضو سے ہی کر رہے ہیں۔

وضو قبولیتِ نماز کی بنیادی شرط ہے۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: "جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں اور جس کا وضو صحیح نہیں اس کی نماز صحیح نہیں ہے۔ اور جو نمازی نہیں وہ صاحبِ دین نہیں ہے اور نماز کو ایمان میں وہی مقام ہے جو کہ سر کو باقی بدن میں حاصل ہے"۔ (تذکرۃ الحفاظ ذہبی، جلد ۳، ص ۵۵۰، طبع لاہور)

تمام مسلمان اس امر پر متفق ہیں کہ اگر کسی نے جان بوجھ کر بغیر وضو یا غلط وضو سے نماز پڑھی تو اُس کی نماز باطل ہوگی اور وہ شخص گناہ گار ہوگا۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک ایسا شخص کافر ہے، کیونکہ اس نے دین کے ساتھ

مذاق کیا ہے۔ (شرح صحیح مسلم نووی، جلد اول، ص ۳۶۳، طبع لاہور)

اور جب ہم وضو پر نگاہ کرتے ہیں تو ہمیں اس میں دو واضح فرق دکھائی دیتے ہیں:

① مکتبِ امامت کے پیروکار وضو کے آخر میں پاؤں کا مسح کرتے ہیں۔

② مکتبِ خلافت کے پیروکار آخر میں دونوں پاؤں دھوتے ہیں۔

آیئے اب ہم دونوں کے استدلال کا جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا حکم کیا ہے اور رسولؐ خدا کا عمل اور فرمان کیا ہے؟

اس مسئلہ کی رہنمائی کے لیے ہم سب سے پہلے قرآن کریم کی طرف رجوع کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَ أَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَ أَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ (سورۂ مائدہ، آیت ۵)

"اے اہلِ ایمان! جب تم نماز کی تیاری کرو تو اپنے چہروں اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھو لو اور اپنے سروں اور ٹخنوں تک پاؤں کا مسح کرو"۔

مکتبِ امامت کے پیروکار کہتے ہیں کہ اس آیت میں دو حکم ہیں: ایک حکم فَاغْسِلُوا "یعنی دھو لو" کا ہے اور دوسرا حکم وَ امْسَحُوا کا ہے اور فَاغْسِلُوا کے تحت چہروں اور ہاتھوں کا بیان ہوا ہے، لہٰذا ان کا دھونا فرض ہے، جب کہ وَ امْسَحُوا کے تحت سر اور پاؤں کا ذکر کیا گیا ہے، لہٰذا اس آیت مجیدہ کے تحت پاؤں کا مسح ثابت ہوتا ہے۔ اور اگر خدا کی مشیت یہ ہوتی کہ سر کے مسح کے بعد پاؤں دھوئے

جائیں تو پھر آیت کا یہ حصّہ کچھ اس طرح سے ہوتا: وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ "یعنی اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں کو ٹخنوں تک دھولیا کرو"۔

جب کہ ہم یہ دیکھتے ہیں آیتِ مجیدہ میں فَاغْسِلُوْا بھی ایک بار ہے اور وَامْسَحُوْا بھی ایک بار ہے، لہٰذا اس سے پاؤں کا دھونا ثابت نہیں ہوسکتا۔

مکتبِ خلافت کا استدلال

مسلمانوں کی ایک بھاری جمعیت اپنے اَسلاف کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے وضو کے آخر میں پاؤں دھوتے ہیں اور وہ اپنے اس عمل کے دفاع میں یہ کہتے ہیں کہ لفظ وَ اَرْجُلَكُمْ کی لام پر زبر ہے، لہٰذا فَاغْسِلُوْا کے متعلق ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں کو ٹخنوں تک دھولو۔

جب کہ مسلکِ خلافت کے مشہور عالمِ دین علامہ فخر الدین رازی لکھتے ہیں کہ زیر زبر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ زبر کے باوجود بھی اس کا معنی مسح کے ہی رہیں گے۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیں:

واما القراءة بالنصب فقالوا ایضا انها توجب المسح و ذٰلك لان قوله: "وامسحوا برؤوسكم فرؤوسكم في محل النصب ولكنها مجرورة بالباء فاذا عطفت الارجل على الرؤوس جاز في الارجل النصب عطفًا على الرؤوس والجر عطفا على الظاهر وهذا مذهب مشهور النحاة اذا ثبت هذا فنقول: ظهرانه يجوز ان يكون عامل

النصب في قوله وارجلكم: هو قوله "وامسحوا" ويجوز ان يكون هو قوله "فاغسلوا" لكن العاملان اذا اجتمعا على معمول واحد كان اعمال الاقرب اولى ، فوجب ان يكون عامل النصب في قوله "وارجلكم" هو قوله "وامسحوا" فثبت ان قراءة "وارجلكم" بنصب اللام توجب المسح ايضا ، فهذا وجه الاستدلال بهذه الاية على وجوب المسح

"اب رہا اَرْجُلَکُم کو زبر کے ساتھ پڑھنا تو اس کے لیے مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے بھی مسح کا وجوب ثابت ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ میں لفظ رؤوس محلِ نصب میں ہے، بوجہ مفعول بہ ہونے کے۔ لیکن "با" حرفِ جارہ کی وجہ سے اس کی "سین" پر زیر آئی ہے تو لفظ "ارجل" عطف عَلَى المَحَل کی وجہ سے منصوب ہوگا۔ اور عطف علَى الظَّاهِرِ کی وجہ سے زیر بھی جائز ہوگی اور یہ نحویوں کا مشہور مذہب ہے۔

چنانچہ جب یہ بات ثابت ہوگئی تو ہم یہ کہتے ہیں کہ وَاَرْجُلَكُمْ میں عاملِ نصب وَامْسَحُوْا ہے اور اس طرح سے فَاغْسِلُوْا بھی عاملِ نصب ہوسکتا ہے، لیکن اصول یہ ہے کہ جب ایک معمول کے دو عامل جمع ہوجائیں تو قریب ترین عامل کو عمل دینا زیادہ مناسب ہوتا ہے۔ تو اس سے یہ امر واجب ہوجاتا ہے

کہ اَرْجُلَکُمْ میں عامل نصب وَامْسَحُوْا ہو۔ اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ وَاَرْجُلَکُمْ کے لام کو اگر زبر سے بھی پڑھا جائے تو بھی یہ آیت وجوب مسح پر دلالت کرتی ہے"۔ (تفسیر کبیر، علامہ فخر الدین رازی، جلد ۱۱/۱۶۱، تیسرا ایڈیشن، طبع بیروت)

امام رازی پاؤں دھونے کی احادیث کے متعلق لکھتے ہیں:

ولا یجوز دفع ذٰلک بالاخبار لانها باسرها من باب الآحاد ونسخ القرآن بخبر الواحد لا یجوز

"مسح کے حکم کو احادیث سے رد کرنا جائز نہیں ہے، کیونکہ احادیث کی حیثیت "احاد" کی ہے اور خبرِ واحد سے قرآن کے حکم کو منسوخ سمجھنا جائز نہیں ہے"۔ (تفسیر کبیر، علامہ فخر الدین رازی، جلد ۱۱/۱۶۱-۱۶۲، تیسرا ایڈیشن، طبع بیروت)

علامہ رازی اسی صفحہ پر مسئلہ الخمیس کے تحت لکھتے ہیں: پاؤں کے دھونے اور ان کے مسح کرنے کے متعلق لوگوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ چنانچہ قفال اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ابن عباس، انس بن مالک، عکرمہ، شعبی اور ابو جعفر امام محمد باقر علیہ السلام کا قول ہے کہ پاؤں کا وضو میں مسح کرنا واجب ہے اور شیعہ امامیہ کا بھی یہی نظریہ ہے۔

ابن عباسؓ کا نظریہ

ابن عباسؓ قرآن مجید کی اس آیت وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِکُمْ وَ اَرْجُلَکُمْ

اِلَى الْكَعْبَيْنِ کے متعلق یہ کہا کرتے تھے کہ اس سے سر کے کچھ حصہ اور پاؤں کا ٹخنوں تک مسح کرنا مراد ہے۔ (تفسیر بیضاوی، جلد اول/۲۱۶۔ تفسیر درمنثور، جلد۲/ ۱۸ا۔ مصنف ابن شیبہ، جلد اول/۲۷)

تفسیر ابن کثیر اور پاؤں کا مسح

ابن کثیر دمشقی اگرچہ اپنے نظریات میں سخت متشدد تھے، لیکن اللہ نے اُن سے بھی حق کے کلمات کہلوائے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

وقد روی عن طائفة من السلف ما یوهم القول بالمسح فقال ابن جریر حدثنی یعقوب بن ابراهیم، حدثنا ابن علیة، حدثنا حمید قال: قال موسٰی بن انس لانس ونحن عنده: یا اِباحمزة ، ان الحجاج خطبنا بالاهواز ونحن معه فذکر الطهور فقال: اغسلوا وجوهکم وایدیکم وامسحوا برؤوسکم وارجلکم، وانه لیس من شئی من ابن اٰدم اقرب من خبثته من قدمیه فاغسلوا بطونهما وظهورهما وعراقیبهما فقال انس صدق اللّٰه وکذب الحجاج قال اللّٰه "وامسحوا برؤوسکم وارجلکم" وکان انس اذا امسح قدمیه بلّهما ، اسناد صحیح الیه

وقال ابن جریر: حدثنا علی بن سهل ، حدثنا مؤمل ، حدثنا حماد ، حدثنا عاصم الاحول عن انس

قال: نزل القرآن بالمسح والسنة الغسل، وهذا ايضا اسناد صحيح

وقال ابن جرير: حدثنا ابوكريب ، حدثنا محمد بن قيس الخراسانی عن ابن جريج عن عمرو بن دينار، عن عكرمة ، عن ابن عباس قال: "الوضوء غسلتان ومسحتان" وكذا روى سعيد بن ابی عروبة ، عن قتادة و قال ابن ابی حاتم: حدثنا ابی، حدثنا ابومعمر المنقری، حدثنا عبدالوهاب، حدثنا علی بن زيد، عن يوسف بن مهران عن ابن عباس "وامسحوا برؤوسكم وارجلكم الی الكعبين" قال هو المسح- ثم قال و روی عن ابن عمر وعلقمة وابی جعفر محمد بن علی والحسن فی احدی الروايات وجابر بن زيد ومجاهد فی احدی الروايات نحوه وقال ابن جرير: حدثنا يعقوب ، حدثنا ابن علية ، حدثنا ايوب قال: رأيت عكرمة يمسح علی رجليه قال: وكان يقوله وقال ابن جرير حدثنی ابوالسائب، حدثنا ابن ادريس، عن داؤد بن ابی هند عن الشعبی قال: نزل جبريل بالمسح ثم قال الشعبی: الا تریٰ ان التيمم ان يمسح ما كان غسلا ويلغی ما كان سحا

وحدثنا ابن ابی زیاد ، حدثنا یزید ، اخبرنا اسماعیل قلت لعامر: ان ناسا یقولون ان جبریل نزل بغسل الرجلین؟ فقال: نزل جبریل بالمسح
(تفسیر بیضاوی، جلد اول/۲۱۶۔ تفسیر درمنثور، جلد ۲/۱۸۷۔ مصنف ابن شیبہ، جلد اول/۳۷)

"سلفِ صالح سے ایسی روایات موجود ہیں جن سے پاؤں کا مسح کرنا ثابت ہوتا ہے۔ جیسا کہ ابن جریر نے بیان کیا ہے کہ حمید کا بیان ہے کہ موسیٰ بن انس نے انس سے کہا: اس وقت ہم انس بن مالک صحابیِ رسولؐ کے پاس موجود تھے۔ اس نے کہا کہ حجاج بن یوسف نے اہواز میں خطبہ دیا اور اس وقت ہم اس کے ساتھ تھے۔ اس نے وضو کا تذکرہ کیا اور کہا کہ اپنے چہروں اور ہاتھوں کو دھولو اور اپنے سروں کا مسح کرو اور پاؤں کو دھولو۔ یاد رکھو، پورے انسانی وجود میں پاؤں نجاست سے قریب تر ہوتے ہیں، لہٰذا انھیں اچھی طرح سے اُوپر نیچے سے دھولو۔

جب انس نے یہ سنا تو کہا کہ اللہ نے سچ فرمایا جب کہ حجاج نے جھوٹ کہا۔ اللہ نے تو فرمایا ہے: وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ

راوی کا بیان ہے کہ جب انس قدموں کا مسح کرتے تو تری سے پاؤں کو گیلا کرتے تھے۔ اس روایت کے اسناد صحیح ہیں۔

ابن جریر نے اپنے استاد سے عکرمہ سے روایت کی ہے۔ اس نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے، انھوں نے کہا کہ وضو دو چیزوں کے دھونے اور دو چیزوں کے مسح کا نام ہے۔

سعید بن ابی عروبہ نے بھی اپنے استاد سے ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ کی آیت میں مسح کا حکم دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ابن عمر، علقمہ، ابوجعفر، امام محمد باقر بن علیؑ اور حسن اور جابر بن زید اور مجاہد سے بھی کئی روایات میں یہی مفہوم منقول ہے۔

ابن جریر بیان کرتے ہیں کہ ہم سے یعقوب نے بیان کیا۔ اس نے ابن علیہ سے نقل کیا۔ اس نے ایوب سے یہ قول نقل کیا کہ میں نے عکرمہ کو دیکھا وہ وضو میں اپنے پاؤں پر مسح کیا کرتا تھا اور وہ مسح کا ہی پرچار کرتا تھا۔

ابن جریر نے اپنے استاد سے شعبی سے روایت کی ہے کہ جبرئیل امینؑ پاؤں کے مسح کا حکم لے کر نازل ہوئے تھے۔ پھر شعبی نے یہ دلیل دی کہ کیا تم نہیں دیکھتے کہ جن اعضا کا دھونا فرض تھا اللہ نے تیمم میں ان کا مسح فرض کیا اور جن اعضا کا وضو میں مسح فرض تھا اللہ نے انھیں تیمم میں بالکل چھوڑ دیا۔

مقصد یہ ہے کہ اگر پاؤں کا دھونا بھی منہ اور ہاتھوں کی طرح سے فرض ہوتا تو اللہ تعالیٰ تیمم میں پاؤں کے مسح کو فرض کرتا۔ لیکن اللہ کی طرف سے تیمم میں پاؤں کے مسح کا فرض نہ ہونا اس

اس کی دلیل ہے کہ وضو میں قدموں کا دھونا فرض ہی نہیں ہے۔

ابن ابی زیاد نے ہم سے بیان کیا کہ مجھ سے یزید نے بیان کیا، اس نے کہا کہ مجھ سے اسماعیل نے بیان کیا کہ میں نے عامر سے کہا کہ لوگ کہتے ہیں کہ جبریل امینؑ پاؤں کے دھونے کا حکم لے کر نازل ہوئے تھے۔

عامر نے جواب دیا کہ یہ جھوٹ ہے، جبریل امینؑ پاؤں کے مسح کا حکم لے کر نازل ہوئے تھے"۔ (تفسیر ابن کثیر، جلد۲/ ۳۹۱۔ در ضمن آیت وضو، مطبوعہ دار الکتاب العربی، بیروت)

آیت تیمم

اللہ تعالیٰ نے سورۂ نساء میں حکم دیا کہ اگر کبھی ایسا موقع آجائے کہ تمہارے پاس طہارت کے لیے پانی موجود نہ ہو تو پھر تیمم کرو۔

فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ○ (سورۂ نساء، آیت ۴۳)

"تو پھر پاک مٹی سے تیمم کرو اور اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کرلو بے شک اللہ بہت معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے"۔

اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے سورۂ مائدہ میں بھی حکم تیمم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ (سورۂ مائدہ، آیت ٦)

"پاک مٹی سے تیمم کر لو اور اپنے چہروں اور ہاتھوں کا مسح کر لو"۔

اس آیتِ مجیدہ سے ہمارا استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وضو میں چار اعضاء کا تذکرہ کیا یعنی منہ، ہاتھ، سر اور پاؤں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آیتِ تیمم نازل فرمائی اور ارشاد فرمایا: اگر پانی میسر نہ ہو تو پھر تیمم کرو اور تیمم میں اپنے چہروں اور ہاتھوں کا مسح کرو۔

حضرت ابن عباسؓ نے کیا ہی خوبصورت استنباط کیا تھا۔ انھوں نے فرمایا: اللہ نے وضو میں دو اعضا کا دھونا اور دو اعضا کا مسح فرض کیا ہے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے تیمم کا ذکر کیا ہے اور جن اعضاء کے دھونے کا وضو میں حکم دیا گیا تھا اللہ نے تیمم میں ان کے مسح کا حکم دیا ہے اور جو دو اعضاء وضو میں مسح میں شامل تھے، اللہ نے تیمم میں انھیں معاف کر دیا۔ (تفسیر درمنثور، جلال الدین سیوطی، جلد۲/ ۱۸۷، طبع لاہور)

اس سے پہلے ہم تفسیر ابن کثیر کے حوالے سے شعبی کا یہ قول نقل کر چکے ہیں کہ جن چیزوں کا وضو میں دھونے کا حکم تھا ان پر تیمم میں مسح کا حکم دیا گیا اور جو چیزیں وضو میں، مسح میں شامل تھیں انھیں تیمم میں چھوڑ دیا گیا۔ (تفسیر ابن کثیر، شامی، جلد۲/ ۳۹۱، در ضمن آیت وضو، مطبوعہ دار الکتاب العربی بیروت)

چنانچہ ابن عباسؓ اور شعبی نے اپنے حسنِ استنباط سے اُمتِ اسلامیہ کو یہ درس دیا تھا کہ اگر پاؤں کا دھونا وضو میں فرض ہوتا تو اللہ تعالیٰ تیمم میں ان پر مسح فرض کرتا۔ تیمم میں مسح کا فرض نہ ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ وضو میں پاؤں کا دھونا ہی فرض نہیں ہے۔

حکمِ قرآن اور عملِ رسولؐ

حضرت حبیبِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری زندگی اتباعِ قرآن میں بسر ہوئی تھی اور اُم المومنین حضرت عائشہ نے کیا ہی خوب کہا تھا کہ پیغمبر کی سیرت قرآن تھی اور آپؐ قرآنِ مجسم تھے۔ لہٰذا یہ کہنا کسی طور پر صحیح نہیں ہے کہ اللہ نے تو قرآن میں پاؤں دھونے کا حکم دیا تھا، لیکن آنحضرتؐ نے اپنی سنت کے ذریعے سے پاؤں دھونے کو رواج دیا تھا۔

اگر اس نظریہ کو مان لیا جائے تو اس سے حکمِ خداوندی اور عملِ رسولؐ میں تضاد لازم آئے گا، جو کہ ناممکن ہے۔ اس حقیقت کے باوجود ہم متلاشیانِ حق کے لیے رسولِؐ اکرم کے قول وفعل کو بھی نقل کرتے ہیں، تاکہ اتمامِ حجت میں کوئی کسر باقی نہ رہے۔

چنانچہ سنن ابوداؤد اور سنن دارقطنی میں صحابی رفاعہ بن رافع سے منقول ہے کہ ہم حبیبؐ خدا کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک شخص نے وضو کیا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: تم لوگوں کی نماز اس وقت تک درست نہ ہوگی جب تک وضو درست نہ ہو اور وضو کا طریقہ یہ ہے:

فیغسل وجهه ویدیه الی المرفقین ویمسح برأسه ورجلیه الی الکعبین

"چہرے کو دھوؤ اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھوؤ اور سر کا مسح کرو اور اپنے پاؤں کا ٹخنوں تک مسح کرو"۔ (سنن ابوداؤد، جلد اول/ ۳۳۵، باب ۲۹۹، حدیث ۸۳۹۔ دارقطنی، جلد اول/ ۳۷۵)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس سلسلہ میں ذاتی کردار کیا تھا؟ اس کے لیے حسب ذیل دو روایات کا مطالعہ فرمائیں:

عبداللہ بن عباد اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ آپؐ وضو کرتے تو آپؐ اپنے دونوں پاؤں پر مسح کرتے۔ (مسند احمد بن حنبل، جلد۴/۴۰)

حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ میں نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ آپؐ ظاہر قدمین پر مسح کیا کرتے تھے۔ (مسند احمد بن حنبل، جلد۲/۹)

ظاہر قدمین سے دو چیزیں مراد لی جاسکتی ہیں:

[۱] قدموں کے اُوپر کا حصّہ [۲] برہنہ قدم۔ جہاں تک قدموں کے اُوپر کے حصّہ کا تعلق ہے تو مسح خواہ موزوں پر ہو یا برہنہ قدم پر، ہوتا ہی ہمیشہ اُوپر کے حصّہ پر ہے، لہٰذا یہ ترجمہ کچھ بہتر نہیں ہے۔ اس حدیث کا صرف یہی ترجمہ صحیح ہے کہ آنحضرتؐ برہنہ پاؤں پر مسح کیا کرتے تھے۔

ابن حجر رقم طراز ہیں: رسولؐ خدا نے وضو میں اپنے دونوں پاؤں پر مسح کیا اور نماز پڑھی۔ (الاصابہ فی تمیز الصحابہ، جلد اول/۳۱۵)

ابن کثیر دمشقی نے امام احمد کے اسناد سے جریر بن عبداللہ البجلی سے یہ روایت کی ہے:

انا اسلمت بعد نزول المائدة وانا رأیت رسول اللہ یمسح بعد ما اسلمت

"میں نے سورۂ مائدہ کے نزول کے بعد اسلام قبول کیا۔ اسلام

قبول کرنے کے بعد میں نے رسولؐ خدا کو پاؤں پر مسح کرتے ہوئے دیکھا"۔ (تفسیر ابن کثیر، جلد۲/۴۹۶، طبع بیروت)

تفسیر مذکور کے حاشیہ پر محقق عبدالرزاق المہدی لکھتے ہیں کہ یہ حدیث مسند احمد کی جلد چہارم/۳۶۳ پر مرقوم ہے۔ اس کے اسناد حسن ہیں۔ زیاد کی وجہ سے اس حدیث کے باقی تمام رواۃ ثقہ ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وضو کیسے کرتے تھے؟ اس کے لیے اس روایت کو پڑھیں:

عن ابی مطر قال بینا نحن جلوس مع علی فی المسجد جآء رجل اعلی علی وقال ارنی وضوء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فدعا قنبر فقال ائتنی بکوز من ماء فغسل وجھہ ویدیہ ومسح رأسہ واحدۃ ورجلیہ الی الکعبین (رواہ عبد بن حمید)

"ابو مطر بیان کرتے ہیں کہ ہم حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک شخص آیا اور اس نے حضرت علیؑ سے کہا کہ آپؑ ہمیں رسولؐ خدا کا وضو کر کے دکھائیں۔

حضرت علی علیہ السلام نے حضرت قنبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو آواز دے کر فرمایا: قنبر! پانی کا ایک لوٹا لاؤ۔ قنبرؓ پانی لائے تو آپؑ نے اپنے چہرے اور دونوں ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھویا۔ پھر آپؑ نے اپنے سر کا ایک مرتبہ مسح کیا۔ پھر آپؑ نے اپنے دونوں

قدموں کا مسح کیا"۔ (فلک النجاۃ بحوالہ کنز العمال، جلد۵/۱۰۸)

اس کے علاوہ حضرت عثمان بن عفان کے متعلق بھی پاؤں پر مسح کرنے کی روایات موجود ہیں۔ (مسند احمد بن حنبل، جلد اول/۵۹، ۶۸)

تفسیر ابن کثیر اور معالم التنزیل بغوی میں عکرمہ علقمہ کے متعلق مرقوم ہے کہ وہ پاؤں پر مسح کرتے تھے۔ ابن کثیر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ ابن ابی حاتم کا بیان ہے کہ عبداللہ بن عمر، جابر بن زید اور مجاہد بھی پیروں پر مسح کرنے کا عقیدہ رکھتے تھے۔ (تفسیر ابن کثیر، جلد۲/۳۹۶، طبع بیروت)

عمل اہلِ بیتؑ

شعبہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام سر اور پاؤں کا مسح کیا کرتے تھے۔ (فتح الباری شرح صحیح بخاری، جزو ۳۳/۳۶۲، سنن بیہقی، جلد اول/۱۵۲)

حضرت امام حسن اور حضرت امام محمد باقر علیہما السلام بھی وضو میں پاؤں پر مسح کو ہی بیان کرتے تھے۔ (ایضاً)

اس مقام پر عام طور پر کچھ احباب یہ سوال کرتے ہیں کہ جب وضو صرف چہرے، ہاتھوں، سر اور پاؤں تک محدود ہے تو پھر ہم کلی کیوں کرتے ہیں اور ناک میں پانی کیوں ڈالتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں فرض وضو کو بیان کیا گیا ہے۔ اب فرض کی رہنمائی کے لیے سنت آگے بڑھی۔ وضو کے پانی کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ پاک ہو اور مضاف بھی نہ ہو، اسی لیے احادیث میں حکم دیا گیا ہے کہ وضو سے پہلے ہتھیلیوں کو دھویا جائے، پھر تین بار کلی کی جائے، پھر تین بار ناک میں پانی

ڈالا جائے۔

پانی کے صاف یا غیر صاف ہونے کے تین معیار ہیں:

① رنگ صحیح ہو ② ذائقہ صحیح ہو ③ بو صحیح ہو۔

جب انسان ہتھیلیوں پر پانی ڈالتا ہے تو رنگت کا علم ہو جاتا ہے اور جب کلی کرتا ہے تو ذائقہ کا پتہ چل جاتا ہے اور جب ناک میں پانی ڈالتا ہے تو بو کا علم ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد وضو کے فرائض شروع ہو جاتے ہیں۔ جس شخص کو اپنے پاؤں مشکوک دکھائی دیں تو وہ وضو سے پہلے انہیں دھو کر پاک کرلے اور وضو کے آخر میں ان پر مسح کرے۔

❖❖❖

باب دوم

اذان

اس مسئلہ کی بحث اور دلائل پر بحث کرنے سے مناسب محسوس ہوتا ہے کہ دونوں مذاہب کی اذان علیحدہ علیحدہ لکھ دی جائے۔

اذانِ شیعہ بیس کلمات پر مشتمل ہے، جو کہ حسب ذیل ہیں:

اَللّٰہُ اَکۡبَرَ = چار مرتبہ

اَشۡہَدُ اَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ = دو مرتبہ

اَشۡہَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰہِ = دو مرتبہ

اَشۡہَدُ اَنَّ عَلِیًّا وَلِیُّ اللّٰہِ = دو مرتبہ

حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ = دو مرتبہ

حَیَّ عَلَی الفَلَاحِ = دو مرتبہ

حَیَّ عَلٰی خَیۡرِ العَمَلِ = دو مرتبہ

اَللّٰہُ اَکۡبَرَ = دو مرتبہ

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ = دو مرتبہ

اذانِ اہلِ سنت حسب ذیل چودہ کلمات پر مشتمل ہے:

اَللّٰہُ اَکۡبَرَ = چار مرتبہ

اَشۡہَدُ اَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ = دو مرتبہ

اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللّٰہِ = دو مرتبہ

حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ = دو مرتبہ

حَیَّ عَلَی الفَلَاحِ = دو مرتبہ

اَللّٰہُ اَکْبَرُ = دو مرتبہ

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ = ایک مرتبہ

نمازِ فجر کی اذان میں دو مرتبہ اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کا اضافہ کیا جاتا ہے اور یوں اذانِ فجر سترہ کلمات اور باقی اذانیں پندرہ کلمات پر مشتمل ہوتی ہیں۔

مکتبِ امامت اور مکتبِ خلافت کی اذان میں بنیادی طور پر چار فرق پائے جاتے ہیں۔ اذانِ فجر میں چار فرق ہیں، جب کہ باقی اذانوں میں تین فرق ہیں۔

پہلا فرق یہ ہے کہ مکتبِ امامت کے پیروکار سرکار رسالت کی گواہی کے بعد دو مرتبہ سرکار ولایت حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام کی ولایت کی گواہی دیتے ہیں۔

اور دوسرا فرق یہ ہے کہ مکتبِ امامت کے پیروکار حَیَّ عَلَی الفَلَاحِ کے بعد حَیَّ عَلٰی خَیْرِ العَمَلِ کہتے ہیں۔ جب کہ مکتبِ خلافت کے پیروکار یہ جملہ نہیں کہتے۔

اور تیسرا فرق یہ ہے کہ برادرانِ تسنن آخر میں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ایک بار کہتے ہیں، جب کہ مکتبِ امامت کے پیروکار دو مرتبہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہتے ہیں۔

اور چوتھا فرق یہ ہے کہ مکتبِ خلافت کے پیروکار نمازِ فجر کی اذان میں حَیَّ عَلَی الفَلَاحِ کے بعد دو مرتبہ اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کہتے ہیں، جب کہ مکتبِ امامت کے پیروکار یہ جملہ نہیں کہتے۔

اذان مسلمانوں کے روز مرہ کے معمولاتِ دین میں سے ہے۔ اسی لیے آیئے ہر طرح کے تعصب اور تنگ نظری کو چھوڑ کر پہلے یہ دیکھیں:

ابومحذورہ صحابی راوی ہیں:

ان رسول اللّٰہ علمه الاذان تسع عشرة كلمة والاقامة سبع عشرة كلمة ثم عدها ابومحذورة تسع عشر كلمة وسبع عشر كلمة

"ابومحذورہ کا بیان ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے اذان کے انیس کلمات سکھائے اور اقامت کے سترہ کلمات کی تعلیم دی"۔

اس روایت پر امام ابوعیسیٰ ترمذی نے لکھا ہے: هذا حديث حسن صحيح "کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے"۔ (ترمذی شریف، حدیث ۱۸۳۔ سنن نسائی باب کم الاذان من کلمة، جلد اول، طبع لاہور/۱۹۲۔ مشکوٰۃ شریف، مترجم عابد الرحمٰن، جلد ۳/۵۹۳ وجلد ۳/۱۴۷۔ بحوالہ احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، دارمی اور ابن ماجہ)

عبداللہ بن عمر کی زبانی سنیے، انھوں نے کہا:

كان الاذان على عهد رسول اللّٰہ مرتين مرتين والاقامة مرة مرة غير انه كان يقول قد قامت الصلاة قد قامت الصلاة

"رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں اذان کے دو دو کلمے تھے اور اقامت کا ایک ایک کلمہ، لیکن اقامت میں قد قامت الصلاة کا جملہ دو مرتبہ کہا جاتا تھا"۔ (مشکوٰۃ

کتاب الاذان، فصل دوم، حدیث ۵۹۳، جلد اول/۱۴۷۔ اس کے متعلق ابن جوزی لکھتے ہیں یہ صحیح السند حدیث ہے۔ بحوالہ نصب الرایہ، جلداول/۲۶۲)

اس حدیث کی رو سے اذان میں چودہ کلمات ہیں۔ ایک اور روایت ملاحظہ فرمائیں:

عن ابی مخدورة ان رسول اللّٰہ علمه هذا الاذان ، اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر ، اشهد ان لا اِلٰه اِلاّ اللّٰہ ، اشهد ان لا اِلٰه اِلاّ اللّٰہ ، اشهد ان محمدًا رسول اللّٰہ ، اشهد ان محمدًا رسول اللّٰہ ، اشهد ان لا اله اِلاّ اللّٰہ ، اشهد ان لا اِلٰه اِلاّ اللّٰہ ، اشهد ان محمدًا رسول اللّٰہ، حی علی الصلاة حی علی الصلاة ، حی علی الفلاح حی علی الفلاح ، اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر ، لا اله اِلاّ اللّٰہ (منتقی الاخبار، تالیف ابن تیمیہ، ص ۲۸۶-۲۸۷، باب صفة الاذان)

''حضرت رسول مقبولؐ نے مجھے یہ اذان تعلیم دی تھی: اللّٰہ اکبر دومرتبہ، اشهد ان لا اله اِلاّ اللّٰہ دومرتبہ، پھر اشهد ان محمدًا رسول اللّٰہ دومرتبہ، پھر اشهد ان لا اِلٰه اِلاّ اللّٰہ دومرتبہ، پھر اشهد ان محمدًا رسول اللّٰہ دومرتبہ، حی علی الصلاة دومرتبہ، حی علی الفلاح دومرتبہ، اللّٰہ اکبر دومرتبہ، لا اِلٰه اِلاّ اللّٰہ ایک مرتبہ''۔

اس حدیث کے تحت اذان کے جملے سترہ بنتے ہیں اور اس اذان کو علمائے اہلِ سنت لفظ ''ترجیع'' کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔

اس سلسلہ کی ایک اور روایت ملاحظہ فرمائیں۔ یہ روایت سنن ابی داؤد میں مرقوم ہے کہ اذان کی کیفیت یہ ہے:

اللّٰہ اکبر چار مرتبہ، اشھد ان لا الٰہ اِلاَّ اللّٰہ ایک مرتبہ، اشھد ان محمدًا رسول اللّٰہ ایک مرتبہ، پھر اشھد ان لا اِلٰہ اِلاَّ اللّٰہ دو مرتبہ، پھر اشھد ان محمدًا رسول اللّٰہ دو مرتبہ، حی علی الصلاۃ دو مرتبہ، حی علی الفلاح دو مرتبہ، اللّٰہ اکبر دو مرتبہ، لا اِلٰہ اِلاَّ اللّٰہ ایک مرتبہ''۔ (سنن ابی داؤد، حدیث ۵۰۰، کتاب الصلاۃ، باب کیف الاذان)

یہ کُل سترہ کلمات بنتے ہیں، جب کہ حدیث صحیح میں اُنیس کلمات کہے گئے ہیں اور سترہ کلمات پر مشتمل یہ اذان ترجیع پر مشتمل ہے۔ اور اگر اس میں سے ایک مرتبہ اشھد ان لا الٰہ اِلاَّ اللّٰہ اور ایک مرتبہ اشھد ان محمدًا رسول اللّٰہ کو حذف کیا جائے تو پھر وہی چدرہ کلمات بنتے ہیں۔

اب اگر ہم یہاں پر یہ عرض کریں کہ برادرانِ تسنن سے انیس کلمات پر مشتمل اذان پوری ہی نہیں ہوتی۔ سیدھی سی بات ہے کہ اگر ان چدرہ کلمات والی اذان میں دو مرتبہ اشھد ان علیًا ولی اللّٰہ اور دو مرتبہ حی علیٰ خیر العَمَل کو شامل کیا جائے تو یہ انیس کلمات بنتے ہیں۔ اس کے علاوہ انیس کلمات کی اذان برادرانِ اہلِ سنت کے پاس بن ہی نہیں سکتی۔

ترجیعی کلمات شامل کرنے سے بھی اُنھیں کوئی مدد نہیں ملی، کیونکہ برادرانِ

ترجیع والی اذان کو آج تک اپنے ہاں رائج نہیں کر سکے اور اس اذان کا شروع نہ ہو سکنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے۔

امام ابوحنیفہ نے تو خدا لگتی کہی ہے کہ ترجیع والی اذان نہ تو مشروع ہے اور نہ ہی مستحب ہے۔ (فقہ الحدیث امام البانی، جلد اول، باب ۱۳۶، ص ۳۲۹)

چنانچہ نووی شرح صحیح مسلم میں لکھتے ہیں:

وقال ابوحنیفة والکوفیون لا یشرع الترجیع عملا بحدیث عبداللہ بن زید فانه لیس فیه ترجیع

''ابوحنیفہ اور کوفیوں نے کہا کہ عبداللہ بن زید کی حدیث سے ترجیع کو عملی طور پر مشروع نہیں سمجھا جاسکتا، کیونکہ اس حدیث میں ترجیع نہیں ہے''۔ (شرح مسلم نووی، جلد اول/۱۶۵)

محدث ابن جوزی کہتے ہیں:

ان الترجیع غیر مسنون

''اذان میں ترجیع غیر مسنون عمل ہے۔ (نصب الرایہ، ص ۲۶۲)

سیدھی سی بات ہے کہ اذانِ اہلِ تسنن چدرہ کلمات پر مشتمل ہے، جب کہ ابومحذورہ کی صحیح ترین روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرتؐ نے انھیں انیس کلمات پر مشتمل اذان کی تعلیم دی تھی۔

اگر جبین پر شکنیں نہ آئیں تو اس کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اذان میں دو مرتبہ اشهد ان علیًا ولی اللہ اور دو مرتبہ حی علی خیر العمل پڑھیں۔ اس طرح سے آپ کی اذان انیس کلمات پر مشتمل اذان بن سکے گی۔ اور اگر ابن عمر کی صحیح السند حدیث کو مدنظر رکھیں کہ ہر جملہ کو دو بار کہنے کا حکم دیا گیا تھا اور یوں آخر

میں لا اِلٰہ اِلاَّ اللّٰہ کو ایک کی بجائے دو بار کہا جائے تو اذان کے بیس کلمات بن جائیں گے، جو کہ مکمل طور پر شیعہ اذان کی عکاسی کرے گی۔

حَیَّ عَلٰی خَیرِ العَمَل

مکتب امامت کے پیرو اپنی ہر اذان میں حی علی الفلاح کے بعد دو مرتبہ حی علٰی خیر العمل کہتے ہیں جب کہ برادرانِ اہلِ سنت کے ہاں یہ کلمہ مروج نہیں ہے۔

آیئے دیکھیں کیا یہ کلمہ زمانہ پیغمبرؐ میں بھی تھا یا نہیں اور صحابہ اور اہلِ بیتؑ کا عمل کیا رہا ہے۔

مفتی عبدالحی لکھنوی نے اپنی کتاب ''تحقیق عجیب فی التثویب'' (ص ۵) میں لکھا ہے کہ لیث بن سعد نے، اُس نے نافع سے روایت کی ہے کہ ابن عمر جس وقت حی علی الفلاح کہتے تو اس کے بعد اکثر اوقات حی علٰی خیر العمل کہتے تھے۔

علاوہ ازیں کتاب المصالحۃ والموافقۃ کے ص ۳۵ میں تعلیق محمد بر مؤطا محمد مولوی عبدالحی نے یہ کلمات لکھے ہیں

> واما فعل ابن عمر وغیرہ فلم یکن دائمیًا بل احیانیًا لبیان الجواز
>
> ''ابن عمر کا یہ فعل ہمیشہ کے لیے نہیں ہوتا تھا وہ کبھی کبھی یہ جملہ کہا کرتے تھے، تا کہ حی علٰی خیر العمل کے جواز کو عملی شکل میں پیش کیا جا سکے''۔

اگر ہم بالفرض مفتی عبدالحی لکھنوی کی یہ بات مان بھی لیں کہ ابن عمر کا یہ دائمی معمول نہ تھا، البتہ وہ اس کے جواز کے لیے کبھی کبھی یہ جملہ کہتے تھے تو پھر غلامانِ صحابہ اس جملہ کو کبھی کبھی اذان میں کیوں نہیں کہتے؟

نیل الاوطار (جلد اول، ص ۳۳۸) میں ہے کہ حدیث مذکور میں ذکر حی علیٰ خیرالعمل کا نہیں ہے اور اہلِ بیتؑ کا مذہب اسے ثابت کرتا ہے اور وہ حی علی الفلاح کے بعد میں ہے۔

اس کلمہ کے قائلین نے کتبِ اہلِ بیتؑ سے استدلال کیا ہے۔ مثل امالی احمد بن عیسیٰ۔ تجرید و احکام اور جامع آلِ محمدؐ کے جن میں اس کلمہ کا اثبات رسولؐ اللہ تک باسناد ہے۔

بیہقی نے سننِ کبریٰ میں باسناد صحیح عبداللہ بن عمر سے روایت کی ہے کہ جب وہ اذان کہتے ہیں۔ اکثر اوقات اس میں حی علیٰ خیرالعمل کہتے تھے اور کتاب مذکور میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ امام علی بن الحسین زین العابدینؑ کہتے تھے کہ یہ پہلی اذان ہے۔

مقصد یہ ہے کہ یہ اذان کا وہ جملہ ہے جو زمانہ پیغمبرؐ میں رائج تھا۔

محب الدین طبری نے اپنی کتاب "کتاب الاحکام" میں زید بن ارقم کے متعلق لکھا ہے کہ وہ اذان میں حی علیٰ خیر العمل کہتا تھا۔

محب طبری نے کہا ہے کہ اس کو ابن حزم اور سعید بن منصور نے اپنی سنن میں ابی امامہ بن سہل بدری سے مرفوعاً نبی اکرمؐ سے روایت کیا ہے کہ حی علی الفلاح کے بعد حی علیٰ خیر العمل کہا گیا اور دوسرے کسی راوی نے بجز طریقہ اہلِ بیتؑ کے مرفوعاً نبی اکرمؐ سے اس کی روایت نہیں کی اور بیہقی نے ایک

حدیث حی علی خیر العمل
کے نسخ میں لکھی ہے، لیکن وہ ایسے طریق سے مروی ہے جس کی مثال سے نسخ ثابت نہیں ہوتا۔ انتھی من النیل۔
کبریت احمر فی بیان علوم شیخ اکبر برحاشیہ یواقیت والجواہر مطبوعہ مصر مؤلفہ شعرانی (جلد اول، ص۴۳) میں ہے کہ شیخ اکبر نے فتوحات مکیہ میں کہا ہے:

"میں اس شخص کی کوئی سند نہیں جانتا جو قول موذن کے حی علی خیر العمل کو مکروہ جانتا ہے"۔

کنز العمال میں مرقوم ہے کہ حضرت بلالؓ اذان میں حی علی خیر العمل کہتے تھے۔ (رواہ طبرانی)
شیعہ کی کتاب تفسیر تنویر البیان (ص۱۶۳) میں شرح تجرید قوشجی اور شرح مقاصد علامہ تفتازانی کتب اہلِ سنت سے منقول ہے کہ حضرت عمر نے یہ کہا تھا:

ثلاث کن علی عهد رسول الله وانا انهاهن واحرمهن واعاقب علیهن وهی متعة النساء ومتعة الحج وحیّ علی خیر العمل

"رسولؐ خدا کے عہد میں تین چیزیں رائج تھیں، میں ان سے منع کرتا ہوں اور ان کو حرام کرتا ہوں اور جو شخص میرے حکم کی خلاف ورزی کرے گا تو میں اُسے سزا دوں گا اور وہ تین چیزیں یہ ہیں: ① متعہ النساء ② متعہ الحج (حج تمتع) ③ حی علی خیر العمل"۔

مکتبِ خلافت کے پیروکاروں نے جب یہ دیکھا کہ خلیفۂ ثانی نے اپنے

"مخصوص مصالح" کے تحت حی علیٰ خیر العمل پر پابندی عائد کی تھی تو اُنھوں نے زمانۂ پیغمبرؐ کی اذان کو چھوڑ دیا اور حی علیٰ خیر العمل کے الہامی جملہ کو بند کر دیا۔ میں اپنے بھائیوں سے درخواست کرتا ہوں۔ اب فرمانِ رسولؐ کے تحت حی علیٰ خیرالعمل کہنا شروع کر دیں۔

حضرت عمر نے حج تمتع پر پابندی عائد کی تھی، لیکن ان کی وفات کے کچھ عرصہ بعد برادرانِ اہلِ سنت نے یہ محسوس کیا کہ یہ پابندی ناجائز ہے اور حج اور عمرہ کے لیے علیحدہ علیحدہ سفر کرنا باعثِ مشقت ہے اور رسولؐ خدا نے بھی حج تمتع کیا تھا اور قرآنِ مجید میں بھی حج تمتع کا حکم موجود ہے تو انھوں نے خلیفۂ دوم کا حکم منسوخ کر دیا تھا اور اس کے بجائے سنتِ رسولؐ کو اپنانے کا اعلان کیا تھا اور آج ہر سال لاکھوں مسلمان حج تمتع کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

علمائے تسنن سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ حضرت عمر نے تین چیزوں سے منع کیا تھا اس میں سے ایک حکم کو تو آپ حضرات نے چھوڑ دیا ہے، لہٰذا اب بھی جرأتِ رندانہ سے کام لیں۔ کیونکہ ہم مسلمانوں کے لیے سیرتِ رسولؐ حجت ہے، لہٰذا اس لیے آپؐ کی اتباع کرنا ضروری ہے، کیونکہ دین میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔

اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوم

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ حضرت خلیفہ نے جہاں زمانۂ رسولؐ کے کلمہ حی علیٰ خیر العمل پر پابندی عائد کی تھی وہاں اپنے بے پایاں اختیارات استعمال کرتے ہوئے اذانِ فجر میں اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوم کا اضافہ کیا تھا۔

اب اس جملہ کی حقیقت بھی ملاحظہ فرمائیں کہ یہ کب ایجاد ہوا اور کیوں

ایجاد ہوا؟ اس کے لیے مستند کتبِ اہلِ سنت کے حسبِ ذیل حوالے ملاحظہ فرمائیں اور پھر اپنے قلب و ضمیر کی عدالت میں خود فیصلہ کریں کہ اذانِ فجر میں رائج یہ جملہ سنتِ پیغمبر کا حصہ ہے یا خلیفہ کی سنت پر عمل ہے؟

کنز العمال (جلد ۴، ص ۲۷۰) میں یہ الفاظ مرقوم ہیں:

عن ابن جریج قال اخبرنی عمر بن حفص ان سعدا اول من قال الصلٰوة خیر من النوم فی خلافة عمر فقال بدعة لو ترکوه وان بلالا لم یؤذن لعمر ان عمر قال لمؤذنه اذ بلغت حی علی الفلاح فی الفجر فقل الصلاة خیر من النوم رواه الدارقطنی و ابن ماجة والبیهقی

''ابن جریج سے منقول ہے کہ مجھے عمرو بن حفص نے خبر دی ہے کہ سعد پہلا شخص تھا جس نے خلافتِ عمر میں الصلاۃ خیر مِنَ النَّوم کہا تھا، جب کہ یہ ایک بدعت ہے۔ بہتر تھا کہ لوگ اس کو ترک کر دیتے۔ حضرت بلالؓ نے حضرت عمر کے کہنے پر اس کلمہ سے اذان نہیں کہی تھی۔ اس کی عبدالرزاق نے روایت کی ہے اور کتاب مذکور کے گذشتہ صفحہ پر ہے کہ ابن عمر سے مروی ہے کہ حضرت عمر نے اپنے مؤذن سے کہا کہ جب تو اذانِ فجر میں حی علی الفلاح پر پہنچے تو اس کے بعد الصلاۃُ خیرٌ مِنَ النَّوم کہا کرو۔ اس کو دارقطنی، ابن ماجہ اور بیہقی نے روایت کیا ہے''۔

امام مالک کی زبانی اس کا واقعہ سنیے:

عن مالك بلغه ان المؤذن جآء يؤذنه لصلاة الصبح فوجده نائما فقال الصلواة خير من النوم فامره ان يجعلها في نداء الصبح

"مالک کہتے ہیں کہ مجھ تک یہ خبر پہنچی ہے کہ مؤذن نماز کی اطلاع دینے کے لیے حضرت عمر کے پاس گئے تو حضرت عمر سوئے ہوئے تھے۔ مؤذن نے انھیں جگانے کے لیے الصلاة خير من النوم "یعنی نماز سونے سے بہتر ہے"۔ حضرت عمر کو یہ جملہ پسند آ گیا اور انھوں نے مؤذن سے کہا کہ آئندہ وہ اس جملہ کو اذانِ فجر میں کہا کرے"۔

روضۃ الاحباب میں بھی امام مالک کی کتاب مؤطا کے حوالے سے مرقوم ہے:

امام مالك در كتاب موطا در بلاغاتِ خويش آورده كه در زمان عمر بن خطاب موذن به نزد او آمد واودا بنماز صبح خواند ويرا در خواب يافت گفت "الصلاة خير من النوم" عمر بيدار شد و مؤذن را فرمودتا آن كلمه را داخل بانگ صبح گرداند (روضۃ الاحباب، جلد اول، ص ۱۳۱، طبع لکھنؤ)

"یعنی امام مالک مؤطا میں لکھتے ہیں کہ خلیفۂ ثانی کے عہد میں مؤذن انھیں نماز کے لیے بلانے کے لیے آیا، تا کہ وہ نماز فجر پڑھیں، لیکن اس نے انھیں نیند میں پایا۔ اس نے کہا:

الصلاۃ خیرٌ مِن النَّوم "نماز نیند سے بہتر ہے"۔ حضرت عمر بیدار ہوئے اور مؤذن سے کہا کہ آئندہ اس جملہ کو نمازِ فجر کی اذان میں کہا کرو"۔

تھویب قابلِ نفرت عمل ہے

اذانِ فجر میں الصَّلاۃُ خَیرٌ مِنَ النَّوم کہنے کے عمل کو اصطلاحی طور پر "تھویب" کہا جاتا ہے۔ یہ ہمارا قول نہیں ہے، بلکہ موطا کے الفاظ کے مطابق حسن بصری اور ابن سیرین نے کہا کہ فجر کے وقت الصَّلاۃُ خَیرٌ مِنَ النَّوم کہنا تھویب ہے۔

اب تھویب کے متعلق یہ روایت بھی ملاحظہ فرمائیں:

عن مجاهد قال كنت مع ابن عمر فسمع رجلا يثوب في المسجد فقال اخرج بنا من هذا المبتدع

"مجاہد کا بیان ہے کہ میں ابن عمر کے ساتھ تھا۔ اُس نے ایک شخص کو دیکھا جو کہ مسجد میں تھویب کر رہا تھا، یعنی الصَّلاۃُ خَیرٌ مِنَ النَّوم کہہ رہا تھا۔ ابن عمر نے کہا: ہمیں اس بدعتی کے پاس سے دُور لے چلو"۔

اس روایت کو عبدالرزاق نے اور مقدس نے ضیاء میں بھی نقل کیا ہے۔

تسہیل القاری شرح صحیح بخاری (پارہ ۴، ص ۳۰۹) میں ہے کہ امام شافعی کا قول ہے کہ تھویب مکروہ ہے اور ایسی ہی روایت امام ابوحنیفہ سے بھی منقول ہے۔

کتاب مذکور کے ص ۳۱۰ میں ہے کہ عترت اور شافعی کا قول یہ ہے کہ

یب یعنی الصَّلاۃُ خَیرٌ مِّنَ النَّوم کہنا بدعت ہے۔

"بحر" میں ہے کہ الصَّلاۃُ خَیرٌ مِّنَ النَّوم کو حضرت عمر نے جاری کیا لیکن ان کے بیٹے نے کہا کہ یہ بدعت ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے یہ جملہ سنا تو اُنھوں نے فرمایا: اذان میں اس چیز اضافہ نہ کرو جو اس میں شامل نہیں ہے۔ اگر یہ جملہ صحیح ہوتا تو حضرت علیؑ، ابن عمر ور طاؤوس اس کا انکار نہ کرتے۔

حَیَّ عَلٰی خَیرِ العَمَل اور الصَّلاۃُ خَیرٌ مِّنَ النَّوم کا معنوی فرق

حَیَّ عَلٰی خَیرِ العَمَل ایک الہامی جملہ ہے جس کی تعلیم حضرت رسولؐ خدا نے دی تھی اور اس کا لفظی معنی یہ ہے کہ "آؤ بہترین عمل کی طرف"۔ اس جملہ میں نماز کو تمام اعمال میں سے بہترین عمل کہا گیا ہے، جب کہ اس کے مدمقابل بنایا جانے والا جملہ الصَّلاۃُ خَیرٌ مِّنَ النَّوم انتہائی ناقص، بھدا اور پھسپھسا سا ہے۔

حَیَّ عَلٰی خَیرِ العَمَل میں نماز کو تمام اعمال سے افضل عمل کہا گیا ہے، جب کہ مصنوعی جملہ میں یہ کہا گیا ہے کہ نماز نیند سے بہتر ہے۔

اہلِ دانش سے درخواست ہے کہ وہ اپنے خدا کو حاضر جان کر اپنے ضمیر کی عدالت میں فیصلہ کریں کہ کیا نماز تمام اعمال سے بہتر ہے یا صرف سونے سے بہتر ہے؟! ہمیں یقین ہے کہ ہر زندہ ضمیر یہ فیصلہ کرے گا کہ ان دونوں کلمات کی معنویت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

علاوہ ازیں یہ مصنوعہ جملہ اتنا غیر موثر ہے کہ اس سے کسی کو بھی نماز کی دعوت نہیں دی جا سکتی۔ مثلاً فجر کا اول وقت ہے۔ ایک طالب علم اُٹھ کر اپنی درسی

کتابیں پڑھنے میں مصروف ہے۔ اتنے میں مؤذن نے اُسے یہ کہہ کر دعوت دی کہ "نماز نیند سے بہتر ہے"۔ وہ جواب میں یہ کہہ سکتا ہے کہ ٹھیک ہے۔ میں مانتا ہوں کہ نماز نیند سے بہتر ہے، مگر میں تو نیند میں نہیں ہوں، میں اپنی درسی کتابیں پڑھنے میں مصروف ہوں۔

لہٰذا ان الفاظ سے کسی بھی طالب علم کو دعوت نماز نہیں دی جاسکتی۔ فرض کریں عدلیہ کا ایک محترم جج ہے۔ وہ صبح سویرے اُٹھ کر ایک مقدمہ کی فائلیں پڑھ رہا ہے اور سوچ رہا ہے کہ اس کا فیصلہ کیسے ہونا چاہیے؟ اتنے میں اسے مؤذن یہ کہہ کر صدا دیتا ہے کہ "نماز نیند سے بہتر ہے"۔ اسے یہ کہنے کا مکمل حق ہے کہ جناب آپ نماز پڑھتے رہیں، نماز نیند سے بہتر ضرور ہے جب کہ میں سویا ہوا نہیں ہوں۔ لہٰذا ان الفاظ سے بھی کسی کو دعوتِ نماز نہیں دی جاسکتی۔

فرض کریں ایک کسان ہے وہ پچھلے پہر اُٹھ کر کھیت میں ہل چلا رہا ہے۔ اتنے میں مؤذن یہ کہہ کر اسے دعوت دیتا ہے کہ "نماز نیند سے بہتر ہے"۔ کسان کو یہ کہنے کا مکمل حق حاصل ہے کہ جناب آپ خود ہی نماز پڑھیں میں سویا ہوا نہیں ہوں۔ میں تو اس وقت زراعت میں لگا ہوا ہوں۔ لہٰذا یہ دعوت اس کے لیے بھی نہیں ہے۔

فرض کریں ایک ورکر ایک فیکٹری میں کام کر رہا ہے۔ اتنے میں اُسے مؤذن کے یہ الفاظ سننے کو ملتے ہیں کہ "نماز نیند سے بہتر ہے"۔ اس کے جواب میں وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ جناب میں تو بیدار ہوں اور اپنے لیے رزقِ حلال کی تلاش میں ہوں۔ لہٰذا یہ دعوت کسی فیکٹری ورکر کے لیے بھی نہیں ہے۔

لطف یہ ہے کہ جو بیدار ہے اُسے ان الفاظ سے دعوت نہیں دی جاسکتی اور

جو نیند میں ہے اُس نے سنا کچھ نہیں ہے، لہٰذا یہ ایسا پھسپھسا جملہ ہے جس سے نہ تو کسی بیدار کو دعوت دی جا سکتی ہے اور نہ ہی کسی سونے والے کو دعوت دی جا سکتی ہے۔

اور اس کے برعکس فرض کریں کہ صبح اول کے وقت اگر ایک طالب علم اپنے امتحان کی تیاری کر رہا ہے تو مؤذن اُس سے کہتا ہے حَیَّ علٰی خَیرِ العَمَل "آؤ بہترین عمل کی طرف"۔ مقصد یہ ہے کہ اگرچہ کتابیں پڑھنا بھی اچھا عمل ہے، لیکن نماز خیر العمل ہے۔

اسی طرح سے اگر ایک محترم جج مقدمہ کی فائلیں دیکھ رہا ہے یا ایک کسان کھیت میں ہل چلا رہا ہے یا ورکر فیکٹری میں کام کر رہا ہے تو اگرچہ ان کے کام اچھے ہیں، لیکن خدائی جملہ ان سب کو مشتمل ہے کہ "آؤ بہترین عمل کی طرف"۔ یعنی تمہارے یہ عمل اگرچہ اچھے ہیں، لیکن اس وقت خیر العمل نماز ہے۔

اذان کا آخری جملہ

برادرانِ اہلِ تسنن اذان کا اختتام ایک بار لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہہ کر کرتے ہیں، جب کہ حریمِ اہلِ بیتؑ سے وابستہ افراد آخر میں دو مرتبہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہتے ہیں۔

آئیے اسلام کے اس حکم کے فلسفہ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اذان کے آغاز میں اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ دو مرتبہ کہا جاتا ہے۔ پھر آخر میں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہنے کی ضرورت کیا ہے؟

اصل بات یہ ہے کہ بعض اوقات بات سچی ہوتی ہے، لیکن گواہی دینا صدقِ نیت سے گواہی نہیں دے رہا ہوتا، اسی لیے وہ سچی بات کہنے کے باوجود بھی جھوٹا ہوتا ہے جیسا کہ سورۂ منافقون کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

إِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۞

"جب منافق آپؐ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ بھی جانتا ہے کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں، لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں"۔

مقصد یہ ہے کہ بات اگرچہ سچ ہے، لیکن وہ یہ گواہی دل کی گہرائی سے نہیں دے رہے ہیں اسی لیے وہ جھوٹے ہیں۔

اذان میں مؤذن یہ گواہی دیتا ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه۔

ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص یہ گواہی صدقِ دل سے نہ دے رہا ہو، بلکہ از روئے منافقت یہ گواہی دے رہا ہو اسی لیے بانئ اسلام نے حکم دیا کہ اس کی تکمیل کے لیے آخر میں لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کہا جائے۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه میں کسی فردِ واحد کی طرف سے گواہی نہیں ہے، لہٰذا یہ جملہ ہر حالت میں سچا ہے اور سچا رہے گا۔

سیدھی سی بات ہے اگر شہادتِ توحید یعنی اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کا جملہ اذان میں ایک بار ہوتا تو آخر میں لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه بھی ایک بار کافی ہوتا، لیکن اذان میں اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کا جملہ دو مرتبہ ہے لہٰذا صدقِ جملہ کا تقاضا یہ ہے کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه بھی آخر میں دو مرتبہ کہا جائے۔

❋❋❋

باب سوم

کیا بسملہ سورت کا حصہ ہے؟

سوال: نماز کے اختلافی مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ آیا بسملہ شریف جزوِ سورہ ہے یا محض تبرکاً ساتھ لگی ہوئی ہے اور کیا نماز میں بسملہ کو بالجہر پڑھنا چاہیے یا نہیں؟

جواب: مکتبِ امامت کے پیروکار نماز میں بسملہ بالجہر پڑھتے ہیں، جب کہ احناف بسملہ نہیں پڑھتے۔ بسملہ شریف کے متعلق ہم برادرانِ اہلِ سنت کی کتابوں کے چند حوالے بطورِ نمونہ پیش کرتے ہیں اور اس کے ساتھ تمام اہلِ انصاف مسلمانوں کو دعوتِ فکر دیتے ہیں کہ خدارا وہ توجہ کریں اور دیکھیں کہ کیا ان کی نماز پیغمبر اکرمؐ کے طریقہ کے مطابق ہے؟

اگر خدانخواستہ کہیں کوئی کمی بیشی کی ہے تو اس کی جیتے جی اصلاح کرلیں۔

تفسیر ابن کثیر میں مرقوم ہے کہ تمام کوفی قراء اور صحابہ وتابعین کی ایک جماعت اور بہت سے سلف صالحین بسملہ کو سورۂ فاتحہ کی پہلی اور مستقل آیت سمجھتے تھے۔ (تفسیر ابن کثیر، جلد اول/ ۹۵، طبع بیروت)

ابن کثیر نے اپنی اسناد سے ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سورۂ الحمد کی سات آیات ہیں اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ان میں سے ایک آیت ہے۔ (تفسیر ابن کثیر، جلد اول/ ۹۸، طبع بیروت)

حضرت اُم سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرمؐ اپنی نماز میں جب سورۂ فاتحہ پڑھتے تو اس کی ابتدا بسملہ سے کرتے تھے۔ (تفسیر ابن کثیر، جلد اول/۱۲۰)

امام فخر الدین رازی نے اس عنوان پر مفصل گفتگو کی ہے، چنانچہ اُنھوں نے تفسیر ابن کثیر کے مذکورہ بالا دلائل لکھنے کے بعد لکھا ہے:

ثعلبی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ ابوبریدہ نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ حضرت رسولؐ خدا نے مجھ سے فرمایا کہ میں تجھے ایسی آیت نہ بتاؤں جو مجھ سے پہلے صرف سلیمان بن داؤد پر نازل ہوئی تھی اور ان کے بعد وہ آیت صرف مجھ پر نازل ہوئی؟

میں نے عرض کیا: یارسولؐ اللہ! ضرور بتایئے۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: جب نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھتے ہو تو اس کی ابتداء میں کیا پڑھتے ہو؟

میں (راوی) نے عرض کیا: میں "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" پڑھتا ہوں۔

آنحضرتؐ نے فرمایا: بس بس! یہ وہی آیت ہے جو حضرت سلیمانؑ پر نازل ہوئی یا مجھ پر نازل ہوئی۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بسملہ شریف قرآنِ مجید اور سورۂ فاتحہ کا حصّہ ہے۔ حضرت اُم سلمہؓ راوی ہیں کہ رسول اکرمؐ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتے تھے پھر الحمدللہ رب العالمین پڑھتے تھے۔

نبی اکرمؐ نے اس کی نماز سنی تو آپؐ نے اُس سے فرمایا: اے شخص! تو نے اپنی نماز توڑ دی ہے کیا تجھے معلوم نہیں ہے کہ بسملہ سورۂ حمد کا حصّہ ہے اور جس نے اُسے چھوڑا اُس نے سورۂ فاتحہ کی ایک آیت چھوڑی ہے اور جس نے ایک آیت

چھوڑی تو اُس نے اپنی نماز توڑ دی ہے۔ نماز سورۂ فاتحہ کے بغیر قبول نہیں ہے اور جس نے اس کی آیت چھوڑی تو اُس کی نماز باطل ہو گئی۔ انھی اسناد سے طلحہ بن عبیداللہ سے روایت ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا:

جس نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو ترک کیا تو اُس نے اللہ کی کتاب کی آیت کو ترک کیا۔ اس کے بعد امام رازی لکھتے ہیں: میں نے یہ تمام احادیث تفسیر شیخ ابی اسحاق ثعلبی سے نقل کی ہیں۔

اس کے بعد امام رازی نے اپنی طرف سے حسب ذیل دلائل پیش کیے ہیں:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کا پڑھنا ابتدائے فاتحہ میں واجب ہے اور جب یہ معاملہ ہے تو اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ بسملہ سورۂ فاتحہ کی آیت ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ ۝ (سورۂ علق، آیت ۱)

"اپنے رب کا نام لے کر پڑھو جس نے پیدا کیا ہے"۔

یہاں یہ کہنا جائز نہیں ہے کہ "باء" صلہ زائدہ ہے، کیونکہ قاعدہ اصلیہ یہ ہے کہ کلام اللہ کے ہر حرف کا کوئی نہ کوئی فائدہ ہے اور جب یہ حرف مفید ہے تو تقدیر آیت یوں بنے گی: اقرا مفتتحا باسم ربک "اپنے رب کے نام سے افتتاح کرتے ہوئے پڑھیں"۔ اور "امر" وجوب کے لیے ہوتا ہے اور یہ وجوب قراءت نماز کے علاوہ ثابت نہیں ہے، لہٰذا اس سے ثابت ہوا کہ نماز میں بسملہ کا پڑھنا واجب ہے، تاکہ نص معطل نہ ہونے پائے۔

بسملہ شریف قرآن کریم میں خطِ قرآن کے ساتھ لکھی جاتی ہے اور تمام

اشارات و کنایات جو قرآن کا حصّہ نہیں ہیں اُنھیں خطِ قرآن سے نہیں لکھا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ سورتوں کے نام اور رکوعات اور ربع و نصف کے نشانات آج تک کسی نے خطِ قرآن میں نہیں لکھے ہیں اور یہ احتیاط اس لیے کی گئی ہے کہ قرآن میں کوئی ایسی چیز شامل نہ ہو جائے جو قرآن کا حصّہ نہیں ہے۔ اب اگر بسملہ قرآن کا حصّہ نہ ہوتی تو اُسے خطِ قرآن میں کبھی نہ لکھا جاتا، جب کہ مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرآن کا حصّہ ہے۔

علاوہ ازیں مسلمانوں کا اس امر پر اجماع ہے کہ قرآن وہی ہے جو "بین الدفتین" (دو جلدوں کے درمیان) موجود ہے اور بسملہ شریف بھی "بین الدفتین" میں موجود ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ بسملہ قرآن کا حصّہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب یعلیٰ نے محمد بن الحسن کے سامنے یہ دلیل پیش کی تھی تو وہ لاجواب ہوگیا تھا۔

ہم یہ کہتے تھے کہ فاتحہ سے قبل بسملہ پڑھنا واجب ہے اور یہ سورۂ فاتحہ کی آیت ہے اور ادھر ابوحنیفہ یہ تسلیم کرتے تھے کہ بسملہ کا پڑھنا افضل ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ پیغمبرؐ خدا بسملہ پڑھتے تھے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: واتبعوہ "تم نبیؐ کی اتباع کرو"۔ لہٰذا اتباعِ نبیؐ کا تقاضا یہ ہے کہ بسملہ کو ہر حالت میں پڑھنا چاہیے۔

ہمارے موقف کی صداقت کی ایک اور دلیل بھی ہے کہ نبی اکرمؐ کا مشہور فرمان ہے:

کل امر ذی بال لا یبدء فیه باسم اللّٰه فهو ابتر

"ہر اہم کام جس کی ابتدا اللہ کے نام سے نہ کی جائے تو وہ کام ناقص اور دم کٹا ہوتا ہے"۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان کے بعد سب سے افضل عمل نماز ہے اور اگر نماز میں خیر سے بسملہ ہی موجود نہ ہو تو وہ نماز قولِ رسولؐ کے تحت "ابتر" قرار پائے گی اور "ابتر" ہونا قابلِ مذمت ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ نے رسولؐ خدا کے دشمن کے لیے فرمایا:

إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ○ (سورۂ کوثر، آیت ۳)

"یقیناً آپؐ کا دشمن ابتر یعنی بے نام ونشان رہے گا"۔

عجیب بات ہے کہ دشمنِ رسولؐ بھی ابتر ہو اور رسولؐ کے اُمتی کی نماز بھی ابتر ہو تو اسی بے فائدہ نماز کی ضرورت ہی کیا ہے؟

اس سلسلہ کے لیے ہماری ایک اور دلیل یہ ہے کہ جب معاویہ کو مکمل اقتدار حاصل ہوگیا تو وہ مدینہ آیا تو اُس نے لوگوں کو نماز پڑھائی، لیکن اُس نے نماز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو چھوڑ دیا۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوا تو ہر طرف سے مہاجرین وانصار نے چیخ کر کہا: کیا تو بھول گیا ہے یہ بتا کہ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کہاں ہے؟

معاویہ نے از سرِ نو نماز پڑھی، جس میں اُس نے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کی تلاوت کی۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بسملہ کے متعلق تمام صحابہ کا اجماع تھا کہ یہ قرآن کا حصّہ ہے اور یہ سورۂ فاتحہ کا حصّہ ہے۔

پھر چند دلائل کے بعد امام رازی مزید لکھتے ہیں: ذکر اللہ کو بالجہر پڑھنا قابلِ تحسین ہے اور انسان چھپاتا تو اس چیز کو جس میں کوئی کمی یا عیب ہو۔ اب ہم ان بھائیوں سے پوچھنا چاہتے ہیں جو بسملہ کو چھپا رہے ہیں کہ انھیں بسملہ میں کون سا عیب اور نقص دکھائی دیا ہے، جس کی وجہ سے اُنھوں نے اس آیت کو چھوڑ دیا ہے؟

جب کہ ذکرِ الٰہی عظیم شرف ہے۔ رسول اکرمؐ کا فرمان ہے: اس شخص کے

لیے خوش خبری ہے کہ مرتے وقت جس کی زبان ذکرِ الٰہی سے تر وتازہ ہو۔

حضرت علی علیہ السلام اپنی مناجات میں کہا کرتے تھے:

یامن ذکرہ شرف للذاکرین

"اے وہ ذات جس کا ذکر ذاکرین کے لیے باعثِ شرف ہے"۔

جب بسملہ شریف ذکرِ الٰہی ہے تو کسی عقل مند کے لیے اس کے چھپانے کا کیا جواز ہے؟

یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؑ تمام نمازوں میں "بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم" کو بلند آواز سے پڑھا کرتے تھے۔

میں (رازی) یہ کہتا ہوں کہ یہ میرے دل میں بہت بڑی حجت ہے اور علیؑ کا عمل میرے دل میں اتنا راسخ ہے کہ مخالفین کے کلمات سے یہ اپنے مقام سے نہیں ہٹ سکتا۔

امام شافعی لکھتے ہیں کہ جب معاویہ نے مدینہ میں نماز پڑھائی اور اس نے بسملہ نہ پڑھی اور رکوع وسجود میں جھکنے کے وقت تکبیر نہ کہی تو سلام کے بعد مہاجرین وانصار نے اس سے کہا تھا:

اے معاویہ! تو نے ہماری نماز میں چوری کی ہے۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم کہاں ہے اور رکوع وسجود کے وقت کی تکبیر کہاں ہے؟

اس اعتراض کی وجہ سے معاویہ نے نماز دوبارہ پڑھی تھی اور اس نے اس نماز میں بسملہ بھی پڑھی اور تکبیریں بھی کہیں۔

امام شافعی کہتے ہیں کہ معاویہ بڑے رُعب رکھنے والا بادشاہ تھا۔ اگر بسملہ باآواز بلند صحابہ میں رائج نہ ہوتی تو کوئی بھی اس کو ٹوکنے کی جسارت نہ کرسکتا تھا۔

اس کے بعد علامہ رازی لکھتے ہیں کہ بیہقی نے سنن کبیر میں ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ حضرت رسول اکرمؐ اپنی نماز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو بلند آواز سے پڑھتے تھے۔ بیہقی نے لکھا ہے کہ حضرت عمر، ابن عباسؓ، ابن عمر اور ابن زبیر بھی بلند آواز سے بسملہ پڑھتے تھے۔ جب کہ حضرت علیؑ کے متعلق تواتر سے یہ بات ثابت ہے کہ آپؑ نماز میں بسملہ بلند آواز سے پڑھتے تھے اور سیدھی سی بات ہے کہ جو بھی دین میں علیؑ کی اقتداء کرے گا وہ ہدایت پالے گا اور اس کی دلیل یہ ہے کہ رسولؐ خدا نے فرمایا تھا:

اللھم ادر الحق مع علی حیث دار

''خدایا! حق کو علیؑ کے ساتھ پھیر دے جدھر بھی وہ پھرے''۔

اس کے بعد علامہ رازی نے ان لوگوں کے دلائل کی تردید کی ہے جو بسملہ کو نماز میں نہیں پڑھتے اور اسی کتاب میں اُنھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ شیعہ بسملہ بالجہر کے قائل ہیں خواہ نماز جہری ہو یا اخفاتی ہو۔ (تفسیر کبیر، جلد اول، اقتباسات از ص ۱۹۷ تا ۲۰۵)

آیئے بسملہ شریف کے لیے کچھ اور روایات ملاحظہ کیجیے، علامہ جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں:

اخرج الدارقطنی وصححه والبیهقی فی السنن عن ابی هریرة قال رسول الله اذا قرأتم الحمد فاقرأوا بسم الله الرحمٰن الرحیم انها اُم القرآن وام الکتب والسبع المثانی و بسم الله الرحمٰن الرحیم احد ایاتها

''دارقطنی نے یہ روایت نقل کی ہے اور کہا ہے کہ یہ صحیح ہے اور

بیہقی نے سنن کبریٰ میں ابوہریرہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب تم سورۂ فاتحہ پڑھو تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ساتھ پڑھو کیونکہ سورۂ فاتحہ اُم القرآن ہے، اُم الکتاب ہے اور سورۂ فاتحہ سبع مثانی ہے اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اس کی ایک آیت ہے"۔ (تفسیر درمنثور، جلد اول/ ۱۱-۱۲)

تفسیر تبیان القرآن میں مرقوم ہے کہ امام شافعی اور امام احمد کے نزدیک بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سورۃ الفاتحہ کی جزو ہے۔

امام شافعی کے نزدیک ہر سورت کے اول میں بسملہ اس سورت کا جزو ہے، اسی لیے ان کے نزدیک ہر رکعت میں فاتحہ اور سورہ سے پہلے بسملہ پڑھی جائے گی۔ (تبیان القرآن، جلد اول/ ۱۵۸-۱۶۰)

نووی صحیح مسلم کی شرح میں لکھتے ہیں:

ومذهب الشافعي وطوائف من السلف والخلف ان البسملة اية من الفاتحة

"شافعی اور سلف وخلف کے بہت سے گروہوں کا مذہب یہ ہے کہ بسملہ سورۂ فاتحہ کی ایک آیت ہے"۔

تفسیر تبیان القرآن (جلداوّل/ ۱۶۱) میں امام نووی کے حوالے سے مرقوم ہے: سنت یہ ہے کہ جہری نماز میں سورۂ فاتحہ اور سورہ سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو باآواز بلند پڑھا جائے۔

ذیل میں ہم چند روایات تفسیر درمنثور سے پیش کرنا چاہتے ہیں:

[۱] ابوعبید اور ابن سعد نے طبقات میں، ابن ابی شیبہ، احمد، ابن خزیمہ، ابن الانباری نے مصاحف میں، دار قطنی، حاکم نے واضح رہے کہ حاکم نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ بیہقی، خطیب اور ابن عبدالبر نے کتاب المسائلہ میں اُم المومنین اُم سلمہؓ سے روایت کی ہے:

ان النبی کان یقرأ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○ مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ ○ اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ○ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ○ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ○ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ ○ قطعھا ایة وعددھا عد الاعراب وعد بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم آیة ولم یعد علیھم

''نبی اکرمؐ سورۂ فاتحہ کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرتے تھے، ایک ایک آیت کو واضح کر کے پڑھتے تھے اور سورۂ فاتحہ کے شروع میں بسملہ پڑھتے تھے''۔

[۲] بریدہ کہتے ہیں کہ رسولؐ خدا نے مجھ سے فرمایا کہ میں مسجد میں سے نکلنے سے قبل تجھے ایسی آیت بتاؤں گا جو مجھ سے قبل سلیمان علیہ السلام کے علاوہ اور کسی پر نازل نہیں ہوئی ہے۔

اس کے بعد آنحضرتؐ اُٹھے، میں بھی آپؐ کے پیچھے چلا، یہاں تک کہ آپ مسجد کے دروازے کے قریب پہنچ گئے۔ آپؐ نے ایک قدم مسجد سے باہر نکالا اور ابھی ایک قدم مسجد میں ہی تھا۔

میں نے عرض کیا: آپ نے مجھ سے وعدہ فرمایا تھا۔ آپؐ نے میری طرف دیکھ کر فرمایا: جب نماز میں تلاوت قرآن کرتے ہو تو ابتداء کس آیت سے کرتے ہو؟

میں نے عرض کیا: وہ ہے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ آپؐ نے فرمایا: بس یہ وہی آیت ہے جو صرف سلیمانؑ بن داوٗدؑ پر نازل ہوئی تھی اور ان کے بعد مجھ پر نازل ہوئی۔

٣ ابوعبید، ابن مردویہ اور بیہقی نے شعب الایمان میں ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ لوگ قرآن کی آیت سے غافل ہو گئے، جب کہ یہ وہ آیت ہے جو سلیمانؑ بن داوٗدؑ اور ہمارے نبیؐ کے علاوہ کسی اور نبی پر نازل نہیں ہوئی۔ اور وہ آیت ہے: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

٤ واحدی لکھتے ہیں کہ ابن عمر نے کہا کہ ہر سورہ کی ابتدا میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نازل ہوئی۔

٥ بیہقی شعب الایمان میں لکھتے ہیں کہ ابن عمر نماز میں بسملہ پڑھتے تھے اور جب ایک سورت ختم کر کے دوسری سورت پڑھتے تو بھی بسملہ پڑھتے تھے اور وہ کہتے تھے کہ قرآنی نسخوں میں بسملہ تمہارے پڑھنے کے لیے لکھی ہوئی ہے۔

٦ دار قطنی نے ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: جبرئیلؑ نے مجھے نماز کی تعلیم دی، اس نے اللہ اکبر کہا۔ پھر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی اور ہر رکعت میں بلند آواز سے بسملہ پڑھی۔

٧ ثعلبی نے علی بن زید بن جدعان سے روایت کی ہے کہ عبادلہ یعنی عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر قراءت کی ابتدا بسملہ کو بلند آواز

سے پڑھ کر کیا کرتے تھے۔

٨ ثعلبی لکھتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کا معمول تھا جب آپؑ نماز میں سورت کی ابتدا کرتے تو آپؑ بسملہ سے کیا کرتے تھے اور جو بسملہ کو ترک کرتا تو آپؑ اس سے فرماتے تھے کہ تو نے کمی کی ہے اور آپؑ یہ کہتے تھے کہ بسملہ ''سبع مثانی'' کا حصّہ ہے۔

٩ ثعلبی نے طلحہ بن عبیداللہ سے روایت کی ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: جس نے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کو چھوڑا تو اس نے کتابِ خدا کی آیت کو چھوڑا۔

١٠ بیہقی نے زہری سے روایت کی ہے کہ نماز میں سنتِ رسولؐ یہ ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو بلند آواز سے پڑھا جائے۔ سب سے پہلے والی مدینہ عمرو بن سعید بن عاص نے اُسے آہستہ سے پڑھنا شروع کیا تھا۔

اب ہم تمام مسلمانوں کو دعوتِ انصاف دیتے ہیں کہ خدارا فیصلہ کریں وہ بسملہ بالجہر کو چھوڑ کر اپنے پیارے نبی کی سنت پر عمل کر رہے ہیں یا بنی اُمیہ کے ایک شخص کی پیروی کر رہے ہیں؟

١١ ابوداؤد، ترمذی، دار قطنی اور بیہقی نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ رسولؐ خدا اپنی نماز کی ابتدا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے کیا کرتے تھے۔

١٢ بزاز، دار قطنی اور بیہقی نے شعب الایمان ابوطفیل کے طریق سے روایت کی ہے، اس نے کہا کہ میں نے علی بن ابی طالبؑ اور عمار سے سنا وہ کہتے تھے کہ رسول اکرمؐ فریضہ نماز میں جب سورۂ فاتحہ پڑھتے تو آپؐ بلند آواز سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتے تھے۔

١٣ دار قطنی، حاکم اور بیہقی نے ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ رسولؐ خدا اپنی

نماز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو بلند آواز سے پڑھا کرتے تھے۔

۱۴ دار قطنی اور حاکم و بیہقی نے "نعیم المجمر" سے روایت کی ہے اور حاکم و بیہقی نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ میں نے ابوہریرہ کے پیچھے نماز پڑھی۔ اُس نے سورۂ فاتحہ کے آغاز میں بسملہ بآواز بلند پڑھی، پھر قراءت کے بعد اس نے رکوع و سجود کیا اور وہ سجدہ میں جاتے ہوئے اللہ اکبر کہتا تھا اور جب وہ کھڑا ہوتا تو اللہ اکبر کہتا اور جب اُس نے سلام پڑھا تو بھی اللہ اکبر کہا۔ پھر اُس نے کہا، اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، میں تم میں سے رسولؐ خدا کی نماز کو زیادہ صحیح انداز سے پڑھ سکتا ہوں۔

۱۵ دار قطنی نے حضرت علی علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ آپؑ نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دونوں سورتوں میں بسملہ بلند آواز سے پڑھا کرتے تھے۔

۱۶ دار قطنی اور بیہقی نے شعب الایمان میں لکھا ہے کہ جابر بن عبداللہ انصاری کا بیان ہے کہ رسولؐ خدا نے مجھ سے فرمایا کہ نماز کی ابتدا کیسے کرتے ہو؟ میں نے کہا: الحمدللہ رب العالمین سے۔ آپؐ نے فرمایا: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھا کرو۔

۱۷ دار قطنی نے ابن عمر سے روایت کی ہے، اُس نے کہا کہ میں نے رسولؐ خدا، ابوبکر اور عمر کی اقتداء میں نمازیں پڑھی ہیں وہ سب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو بلند آواز سے پڑھا کرتے تھے۔

۱۸ دار قطنی نے نعمان بن بشیر سے روایت کی ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کعبہ کے پاس جبریلؑ نے مجھے امامت کرائی تو اس نے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو بلند آواز سے پڑھا۔

۱۹ دار قطنی نے اُم المومنین بی بی عائشہ سے روایت کی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو بلند آواز سے پڑھا کرتے تھے۔

۲۰ دار قطنی نے حکم بن عمیر سے روایت کی ہے، وہ بدری تھا۔ اس نے کہا کہ میں نے رسول اکرمؐ کے پیچھے نماز پڑھی۔ آپؐ نے نماز شب، نماز فجر اور نماز جمعہ میں بسملہ بلند آواز سے پڑھی۔

۲۱ ابوعبید نے محمد بن کعب القرظی سے روایت ہے کہ فاتحۃ الکتاب کی سات آیات ہیں اور ان میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم شامل ہے۔ (تفسیر در منثور، جلد اول/ ۷-۸، منشورات مکتبۃ المرعشی، قم، ایران)۔

***

باب چہارم

نماز میں ہاتھ کھولنا اور باندھنا

مسلمانوں کی نماز میں ایک واضح فرق جو دکھائی دیتا ہے وہ ہاتھ کھولنے اور باندھنے کا ہے۔

شیعہ مسلمان ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے ہیں اور سُنّی مسلمان ہاتھ باندھ کر نماز پڑھتے ہیں۔ البتہ امام مالک کی فقہ کے پیروکار بھی ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے ہیں۔ آیئے اس مسئلہ کا غیر جانب داری سے تجزیہ کریں اور دیکھیں کہ ہمارے پیارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرزِ عمل کیا تھا؟

اس کے لیے ہمیں مذہبی فکر اور آبائی طریقہ کے بجائے صرف اور صرف رسولؐ خدا کے فرمان اور آپؐ کے عمل کی پیروی کرنی چاہیے، کیونکہ یہی حق کا سیدھا راستہ ہے۔

اس سلسلہ میں صاحب فلک النجاۃ نے کیا ہی عمدہ فرمایا ہے:

میں نے کتب اہلِ سنت سے بہت جستجو کی، مگر کوئی حدیث مرفوع قوی نہ قولی نہ ضعیف نماز میں ہاتھوں کے باندھنے کے متعلق دکھائی نہ دی۔ حدیث پاک میں نہ تو ناف کے اُوپر باندھنے کا حکم ہے اور نہ ہی ناف کے نیچے اور نہ ناف سے متصل۔

لہٰذا جب باندھنا ثابت نہیں ہے تو ارسالِ یدین بالضرورۃ ثابت ہوتا ہے کیونکہ وہ اصل فطرت ہے اور فطرۃ اللّٰہ التی فطر الناس علیہا کا مصداق ہے،

کیونکہ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو اس کے ہاتھ کھلے ہوتے ہیں اور جب انسان چلتا ہے تو ہاتھ کھلے ہوتے ہیں اور جب سوتا ہے تو بھی ہاتھ کھلے ہوتے ہیں اور غسل و کفن و دفن میں بھی ہاتھ کھلے ہوتے ہیں اور جب حشر کے دن دائیں بائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال دیا جائے گا تب بھی ہاتھ کھلے ہوں گے۔

قبض یدین یعنی ہاتھ باندھنے کی اگر کچھ روایات ملتی بھی ہیں تو ان میں شدید تعارض اور تضاد پایا جاتا ہے۔ کیونکہ اس طرح کی مصنوعی روایات تین طرح کی ہیں: کچھ میں کہا گیا ہے کہ ناف کے نیچے ہاتھ باندھے جائیں، کچھ ایسی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ ناف سے اوپر ہاتھ باندھے جائیں اور خیر سے کچھ ایسی روایات بھی ہیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ سینہ پر ہاتھ باندھے جائیں۔

اور یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ جب دو احادیث آپس میں متعارض ہوں تو دونوں ساقط عن الاعتبار ہوجاتی ہیں۔ لہٰذا جب ہاتھ باندھنے کی روایات باہمی تعارض کی وجہ سے ساقط قرار پائیں گی تو ہاتھ کھولنا اصل ہے وہ خود بخود ثابت ہوجائے گا۔

حضرت رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے اہل بیتؑ و صحابہ ہاتھ کھول کر نماز پڑھا کرتے تھے، جیسا کہ فتاویٰ عبدالحی میں یہ روایت ہے:

عن معاذ ان رسول اللّٰه کان اذا قام فی الصلاة رفع یدیه قبال اذنیه فاذا کبر ارسلهما

''معاذ بن جبل صحابی رسول راوی ہیں کہ جب رسولؐ خدا نماز میں کھڑے ہوتے تو تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کرتے تھے اور اپنے ہاتھوں کو کانوں کے سامنے تک بلند کرتے تھے اور

تکبیرۃ الاحرام کے بعد آپؐ اپنے دونوں ہاتھوں کو کھول دیتے تھے''۔

اس کی طبرانی نے روایت کی ہے۔ ابن ابی شیبہ لکھتے ہیں:

وکان ابن الزبیر اذا صلی ارسل یدیہ

''ابن زبیر جب نماز پڑھتے تو دونوں ہاتھ کھول کر پڑھتے تھے''۔

شیخ دہلوی نے اپنی کتاب فتح المنّان فی تائید مذہب النعمان میں یہ الفاظ لکھے ہیں:

مذھب مالك ارسال الیدین وھو عزیمة عندہ والوضع رخصة

''مالک کا مذہب یہ ہے کہ نماز ہاتھ کھول کر پڑھی جائے اور ہاتھ کھولنا اُس کے نزدیک عزیمت یعنی ضروری ہے، جب کہ باندھنے کی صرف رُخصت ہے''۔

عینی شرح کنزالدقائق میں لکھتے ہیں:

قال مالك العزیمة فی الارسال والرخصة فی الوضع والاخذ لان النبی کان یفعل کذٰلك وکذا اصحابه حتٰی تنزل الامر من رؤوس اصابعھم

''مالک نے کہا ہے کہ عزیمت (فضیلت) ہاتھ کھول کر نماز پڑھنے میں ہے اور ہاتھ باندھنے کی صرف رخصت ہے کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب اس حد تک ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے تھے کہ ان کی انگلیوں کے سروں میں

خون اُتر آتا تھا"۔ (ارسال یدین بحوالہ اصلاح، جلد ۱/۱۱)

ملا معین سندھی دراسات اللبیب (ص ۳۴۰، مطبوعہ لاہور) میں لکھتے ہیں:

امام مالک کے نزدیک مدینہ منورہ کے لوگوں کا اجماع حجت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالک حالتِ نماز میں ہاتھ کھلے رکھتے تھے۔ اور اس سلسلہ میں اُنھوں نے اہلِ مدینہ کے عمل پر اعتماد کیا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ امام مالک کے زمانہ تک اہلِ مدینہ ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے تھے اور یہ عمل اہلِ مدینہ پر اجماع کی ہی برکت تھی کہ امام مالک نے ہاتھ کھول کر نماز پڑھنے کا فتویٰ دیا تھا۔ اور اگر اس دور میں اہلِ مدینہ میں ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنے کا رواج ہوتا تو امام مالک ہاتھ کھول کر نماز پڑھنے کا فتویٰ نہ دیتے۔

مستخلص شرح کنز برحاشیہ کنز مطبوعہ مطبع حنفی، صدیقی واحمدی دہلی (ص ۲۳) میں ہے:

وقال مالك السنة هو الارسال لكنه اشق على البدن والوضع للاستراحة ودل عليه مارواه عن ابراهيم النخعي انه قال انهم يفعلون ذلك مخافة اجتماع الدم في رؤوس الاصابع لانهم كانوا يطيلون الصلاة

"امام مالک نے کہا کہ سنت یہ ہے کہ ہاتھ کھول کر نماز پڑھی جائے، لیکن یہ عمل بہت مشقت طلب ہے۔ آرام کے لیے اگر انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھ لے تو حرج نہیں ہے۔ اس پر ابراہیم نخعی کی روایت دلالت کرتی ہے۔ اُس نے کہا کہ لوگ لمبی لمبی نمازیں پڑھتے تھے اور طویل قیام کی وجہ سے ہاتھوں کی انگلیوں

میں خون اُتر آتا تھا۔ چنانچہ اس سے بچنے کے لیے لوگوں نے
ہاتھ باندھ کر نماز شروع کر دی تھی"۔

واضح رہے کہ ابراہیم نخعی کوفہ کے رہائشی تھے اور وہ فقیہہ اور ثقہ تھے۔
(تقریب، ص ۲۳)

تسہیل القاری شرح صحیح بخاری (پارہ ۳، ص ۸۴۰-۸۴۷) میں لکھا ہے کہ نماز میں ہاتھ باندھنا واجب نہیں ہے اور اگر یہ عمل واجب ہوتا تو اہلِ بیتؑ کرام اُسے ترک کیوں کرتے؟ لہٰذا اہلِ بیتؑ کا اس عمل کو ترک کرنا اس کے سنت نہ ہونے کی دلیل ہے۔

پھر مؤلف نے لکھا کہ بالجملہ امام مالک، امام محمد باقرؑ، ابراہیم نخعی (ابوحنیفہ کے استاد) عبداللہ بن زبیر، حسن بصری، لیث بن سعد اور اوزاعی وغیرھم سے روایت ہے کہ نماز میں ہاتھ کھولنا نبی اکرمؐ کا مسنون عمل ہے۔ اُمت کے ان بزرگوں کا عمل سنتِ رسولؐ سے ماورا نہیں ہو سکتا۔

نووی شرح صحیح مسلم میں (جلد اول/۲۳۷) لکھتے ہیں: مالک سے دو روایتیں ہیں: ایک روایت یہ ہے کہ ہاتھوں کو سینہ کے نیچے باندھے اور دوسری روایت یہ ہے کہ نماز میں دونوں ہاتھوں کو کھول دے اور ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر نہ رکھے اور اس کے جمہور اصحاب کی بھی یہی روایت ہے اور یہی ان کے نزدیک زیادہ مشہور ہے۔ اور لیث بن سعد کا مذہب یہی ہے۔ نیز مالک سے یہ بھی منقول ہے کہ نوافل میں ہاتھ باندھنے چاہئیں اور فرائض میں ہاتھ کھولنے چاہئیں۔ اور اس کے بعد بصری اصحاب نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔

کتاب روضہ ندیہ میں مرقوم ہے کہ ہاتھ کھولنے کا عمل بعض تابعین مثلاً حسن

(التوفی ۱۱۰ھ)، ابراہیم، ابن مسیب، ابن سیرین (التوفیٰ ۱۱۰ھ اور سعید بن جبیر (التوفیٰ ۹۵ھ) سے منقول ہے جیسا کہ ابن ابی شیبہ نے اس کی روایت کی ہے۔ اگر اُنھیں ہاتھ باندھنے کی روایت پہنچی ہے تو وہ اس پر محمول ہے کہ اُنھوں نے اُسے سنتِ ہدیٰ میں سے نہیں سمجھا، بلکہ اُسے دیگر عادات کی طرح سے لوگوں کی عادت سمجھا ہے، اس لیے وہ ارسالِ یدین کی طرف مائل ہوئے تھے اور وضع کو بھی جائز سمجھتے ہوں گے، لیکن اُنھوں نے اصل بنا پر عمل کیا تھا، کیونکہ ہاتھ باندھنا ایک جدید امر ہے جو کہ دلیل کا محتاج ہے۔

ہاتھ باندھنے پر اصرار کیوں؟

احادیث سے ہاتھ کھولنا ثابت ہے جیسا کہ آپ نے اس کی تفصیل ملاحظہ فرمائی اور سلفِ صالح اور اہلِ بیتؑ اور تابعین کا عمل بھی یہی رہا ہے۔ آخر اس کے باوجود ہاتھ باندھنے پر اصرار کیوں کیا جاتا ہے؟

تنویر العینین کے مؤلف نے اس کا یہ جواب دیا ہے:

ویحکی ان الامام مالك حکم بالارسال مع انه کان مشهورا فی القرن الاول واتفق علیه اکثر العلماء فی القرون الاخر وقالوا ان هذه الفعل فی هذا البلاد تشبه بالروافض حیث ترك سوی مذهب الحنفیة فلم یبق فاعلوه غیر الشیعة وقد قال النبی اتقوا مواضع التهم— قلنا هذا من قصورکم حیث ترکتموه مقار شعار الهم فعلیکم بالاتفاق علی فعله لئلا

يبقى مختصابه وترك السنة للتحرز عن التشبيه بالفرق الضالة غير مشروع

"بیان کیا جاتا ہے کہ امام مالک نے نماز میں ہاتھ کھولنے کا حکم دیا تھا اور وہ قرنِ اول کا مشہور امام تھا۔ اس پر آخری قرون کے علماء کا بھی اتفاق ہے۔ مگر ہمارے علماء اپنے ہاتھ باندھنے کی یہ توجیہہ پیش کرتے ہیں کہ وہ موجودہ دور میں یہ عمل روافض یعنی شیعوں سے تشبیہ رکھتا ہے، کیونکہ عام بلاد اسلامی میں مذہب حنفیہ کے پیروکار ہیں اور شیعوں کے علاوہ اور کوئی فرقہ ہاتھ کھول کر نماز نہیں پڑھتا اور اگر ہم نے ہاتھ کھول کر نماز پڑھی تو ہم پر شیعہ ہونے کی تہمت عائد کی جائے گی اور نبی اکرمؐ کا یہ فرمان ہے کہ اپنے آپ کو تہمت کے مقامات سے بچاؤ۔

اس کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ تو تمہارا قصور ہے۔ تم نے سنت کو چھوڑ دیا تو یہ شیعوں کا شعار بن گیا اور تمہارا فریضہ ہے کہ تم رسولؐ خدا کی سنت پر مل کر عمل کرو تا کہ اس عمل کو شیعیت کی علامت کی حیثیت ہی حاصل نہ رہے اور گمراہ فرقوں کی تشبیہ سے سنت کو چھوڑنے کا کوئی شرعی جواز نہیں ہے"۔

علامہ شعرانی میزان کبریٰ کے ص ۱۳۰-۱۳۱ پر لکھتے ہیں:

قول مالك في اشهر روايتيه انه يرسل يديه ارسلا ومع قول الاوزاعي انه يتخير ثم نقل عن

شیخه علی الخواص من عرف من نفسه العجز من مراعاة کون یدیه تحت صدره فی الصلاة الامع الغفلة عن کمال الاقبال علی الله عزوجل فارسال یدیه بجنبیه اولٰی به وبه صرح الشافعی فی الام فقال وان ارسلهما ولم یعبث بهما فلا بأس

"امام مالک کا مشہور قول یہ ہے کہ نماز ہاتھ کھول کر پڑھنی چاہیے۔ اوزاعی کہتے ہیں کہ نمازی کو اختیار ہے چاہے تو کھول کر پڑھے چاہے تو ہاتھ باندھ کر نماز پڑھے۔

پھر شعرانی نے اپنے شیخ علی الخواص کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جو شخص یہ سمجھے کہ ہاتھ باندھے رہنے کی وجہ سے اور بندھے ہاتھوں پر نگاہیں مرکوز رکھنے کی وجہ سے خدا کی طرف مکمل توجہ سے غافل ہو سکتا ہے تو اُس کے لیے یہ بہتر ہے کہ وہ اپنے دونوں ہاتھ کھول دے اور اس کے لیے ہاتھوں کا دونوں پہلوؤں سے لگا لینا زیادہ مناسب ہے۔ امام شافعی نے کتاب الام میں اس کی تصریح کی ہے کہ اگر نمازی ہاتھ کھول کر نماز پڑھے، بشرطیکہ دونوں ہاتھوں سے کھیلنا شروع نہ کر دے تو اُس کے لیے ہاتھ کھولنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے"۔

علامہ وحید الزمان ہدیۃ المہدی میں لکھتے ہیں:

فمن جعل الارسال من شعائر الروافض فقد اخطأ

"جس نے نماز میں ہاتھ کھولنے کو شیعوں کا شعار قرار دیا تو

اُس نے غلطی کی ہے"۔ (ملاحظہ فرمائیں، بہجۃ المہدی، جلد ۱۳۶/۴)

نیل الاوطار (جلد۲/ ۷۶) میں یہ کلمات مرقوم ہیں:

و روی ابن المنذر عن ابن الزبیر والحسن البصری والنخعی انه یرسلهما ولا یضع الیمنٰی علی الیسریٰ ونقله النووی عن اللیث و ابن سعد ونقله المهدی فی البحر عن القاسمیة والناصریة ونقله ابن القاسم عن مالك وهی روایة جمهور اصحابه عنه وهی المشهورة عندهم

"ابن منذر نے ابن زبیر، حسن بصری اور نخعی سے روایت کی ہے وہ ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے تھے اور دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر نہ رکھتے تھے۔ اسی کو نووی نے لیث اور ابن سعد سے نقل کیا اور اس کو مہدی نے "بحر" میں قاسمیہ و ناصریہ اور امام محمد باقرؑ سے نقل کیا ہے اور اسی کو ابن قاسم نے مالک سے نقل کیا ہے اور وہی روایت اس کے جمہور اصحاب سے ہے اور وہی ان کے ہاں زیادہ مشہور ہے"۔

ابن سید الناس نے اوزاعی سے نقل کیا ہے کہ نمازی کو اختیار ہے چاہے تو ہاتھ کھول کر نماز پڑھے اور چاہے تو ہاتھ باندھ کر نماز پڑھے۔ اور ص ۷۸ میں ہے کہ ابن منذر نے اپنی بعض تصانیف میں کہا ہے کہ نبی اکرمؐ سے ہاتھ باندھنے اور کھولنے کے سلسلہ میں کچھ بھی منقول نہیں ہے، لہٰذا نمازی کو اختیار ہے۔

شعرانی نے کبریتِ احمر (جلد اول/۵۷، طبع مصر) میں لکھا ہے: حق یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں کا سینہ پر ہونا کامل لوگوں کے لیے ہے جن کو ہاتھ باندھنے کا عمل خدا سے مشغول نہ کرے، جب کہ غیر کامل افراد یعنی عوام کے لیے ہاتھ کھولنا زیادہ بہتر ہے۔

شعرانی نے میزان کبریٰ (جلد اول/۱۳۰) میں تصریح کی ہے کہ ہاتھ باندھنا اکابر علماء اور اولیاء کے ساتھ مخصوص ہے، بخلاف اصاغر یعنی عوام کے۔ ان کے لیے دونوں ہاتھوں کا کھلا رکھنا زیادہ بہتر ہے۔ جیسا کہ مالک نے کہا ہے اور اس کی توضیح اس طرح سے ہے کہ دائیں ہاتھ کا بائیں ہاتھ پر رکھنا اس کی طرف ذہن کو متوجہ رکھنے کا محتاج ہے، جس کی وجہ سے مناجاتِ الٰہی کے کمالِ اقبال و توجہ سے نکل جاتا ہے جب کہ یہی خلوص اور توجہ الی اللہ تو روحِ نماز ہے اور یہی حقیقتِ نماز ہے۔

سید علی اظہر صاحب نے اپنے رسالہ ارسالِ یدین ص ۸۴ میں لکھا ہے کہ علامہ عینی نے لکھا ہے کہ ابن منذر کا بیان ہے کہ عبداللہ بن زبیر، حسن بصری اور ابن سیرین نماز میں ہاتھ کھلے رکھتے تھے اور امام مالک کے نزدیک بھی مشہور روایت یہی ہے، البتہ مالک نے کہا کہ اگر نمازی طوالتِ نماز کی وجہ سے ہاتھ لٹکائے تھک جائے تو آرام کی غرض سے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھ لے۔

حافظ نے فتح الباری (جلد اول/۲۰۶) میں لکھا ہے کہ ابن قاسم نے مالک سے ارسالِ یدین کو روایت کیا ہے اور مالک کے اکثر اصحاب کا بھی یہی مذہب ہے۔ علاوہ ازیں مالک سے فریضہ اور نافلہ کے اندر فرق مروی ہے۔ بعض اصحاب مالک ایسے ہیں جو ہاتھ باندھنے کو مکروہ جانتے ہیں۔ ابن حاجب نے یہ نقل کیا ہے کہ یہ جواز اس وقت ہے جب آرام لینے کے واسطے باندھے۔ انتہیٰ۔

کیا ہاتھ باندھنے کی روایت صحیح ہے؟

ہمارا اول و آخر مقصد حقیقت کا اُجاگر کرنا ہے۔ ممکن ہے کہ ہماری پیش کردہ سابقہ بحث کے بعد کوئی شخص اپنے مذہب کی کتابوں سے ہاتھ باندھنے کی روایات پیش کرے۔ اسی لیے حفظِ ماتقدم کے لیے ہم خود ہی وہ روایات یہاں نقل کرتے ہیں اور ان روایات کی علمی حیثیت بھی اپنے انصاف پسند قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہم تمام انصاف پسند افراد کو دعوتِ فکر دیتے ہیں کہ خدارا وہ خود ہی انصاف کریں اور دیکھیں کیا اس طرح کی کمزور اور مصنوعی احادیث سے ہاتھ باندھنے کا جواز ثابت کیا جاسکتا ہے؟

① ان علیا قال السنة وضع الکف علی الکف فی الصلاة تحت السرة

"حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ نماز میں ایک ہتھیلی کا دوسری ہتھیلی پر ناف کے نیچے رکھنا سنتِ رسولؐ ہے"۔ (سنن ابوداؤد، کتاب الصلاۃ، باب ۲۶۹، حدیث ۷۵۱-۳، ص ۱۰۵۔ یہی روایت سننِ بیہقی (جلد۲/۳۱) پر بھی مرقوم ہے۔

اب حدیث بالا کی حقیقت ملاحظہ فرمائیں۔

أ: ڈاکٹر علامہ شفیق الرحمٰن اپنی کتاب نماز نبوی، صحیح احادیث کی روشنی میں (دارالاسلام) کے ص ۱۴۵ پر لکھتے ہیں: رہی حضرت علیؑ کی روایت، تو اُسے امام بیہقی اور حافظ ابن حجر نے ضعیف قرار دیا ہے۔

ب: اس حدیث کے متعلق امام نووی نے شارح صحیح مسلم اپنی کتاب شرح مسلم (جلداول/۱۷۳) میں یوں لکھا ہے:

واما حدیث علی انه قال من فی الصلاة وضع الکف
علی الکف تحت السرة ضعیف متفق علی تضعیفه،
رواه دارقطنی والبیهقی من روایة ابی شیبة
عبدالرحمٰن بن اسحاق الواسطی وهو ضعیف بالاتفاق
''حضرت علیؓ کی طرف منسوب حدیث کہ نماز ہاتھ باندھ کر
پڑھنی چاہیے، تو یہ حدیث ضعیف ہے اور اس کے ضعف پر تمام
محدثین متفق ہیں۔ اس کو دارقطنی اور بیہقی نے ابی شیبہ
عبدالرحمٰن بن اسحاق الواسطی کی روایت سے لکھا ہے جو کہ
بالاتفاق ضعیف ہے''۔

ت: اس حدیث کا راوی ابوشیبہ عبدالرحمٰن بن اسحاق الواسطی ہے اور اس کے متعلق تقریب التہذیب، ص ۲۲۵ پر لکھا ہے:

عبدالرحمٰن بن اسحاق بن حارث الواسطی
ابوشیبة ویقال کوفی قال احمد ضعیف
''امام احمد نے اس کے متعلق کہا ہے کہ وہ ضعیف الحدیث تھا''۔

ج: عینی شرح بخاری میں لکھتے ہیں:

قلت هذا قول علی بن ابی طالب واسناده الی النبی غلط
''میں کہتا ہوں یہ علی بن ابی طالبؓ کا قول ہے اور نبی اکرمؐ کی
طرف اس کی نسبت دینا غلط ہے''۔

مقصد یہ ہے کہ یہ بات نہ تو حضرت علیؓ نے کہی تھی اور نہ ہی نبی اکرمؐ نے فرمائی تھی:

ان الذی روی عن علی فیہ مقال لان فی سندہٖ
عبدالرحمٰن بن اسحاق الکوفی قال الاحمد لیس بشئی
''حضرت علیؓ سے جو روایت منسوب کی گئی ہے اس کی سند میں
عبدالرحمٰن بن اسحاق کوفی ہے اور احمد نے اس کے متعلق کہا ہے
کہ وہ کچھ بھی نہیں ہے، یعنی جھوٹا ہے''۔

ح: علامہ محمد داؤد راغب رحمانی مترجم منتقی الاخبار لاامام ابن تیمیہ اپنے ترجمہ میں اس حدیث کے متعلق ص ۳۶۹ پر لکھتے ہیں: ''اس حدیث کی اسناد کا مدار عبدالرحمٰن بن اسحاق کوفی پر ہے جو کہ منکر اور ضعیف راوی ہے''۔

علاوہ ازیں اسی مفہوم کی ایک روایت کچھ اس طرح سے ہے کہ ابوجریر جتی اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ کو دیکھا کہ دائیں ہاتھ سے بائیں پہونچے کو ناف کے اُوپر پکڑے ہوئے تھے۔

اس روایت کی سند میں ابوطالوت عبدالسلام بن ابن حازم ہیں۔ ابوداؤد نے فرمایا: وہ جھوٹی روایات اختراع کرتا تھا، لہٰذا یہ روایت بھی ناقابلِ قبول ہے۔

علاوہ ازیں ابوہریرہ سے سنن ابی داؤد میں یہ روایت منقول ہے کہ ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنا سنت ہے۔

اس روایت کی سند میں بھی وہی عبدالرحمٰن بن اسحاق ہے جو کہ بالاتفاق ضعیف ہے۔

علامہ ناصر الدین البانی کی کتاب فقہ الحدیث جس کی ترتیب وتھذیب عمران ایوب لاہوری نے کی ہے۔ جلد اول، ص ۴۰۸ پر اُنھوں نے حضرت علیؓ سے منسوب غلط قول کی تردید کی ہے اور اس غلط روایت کے متعلق لکھا ہے کہ امام احمد نے

مسند احمد کی جلد اول/ ۱۱۰ اور امام بیہقی نے سنن کی جلد ۲/ ۳۱، امام نووی نے الخلاصہ جلد اول/ ۳۵۹۔ نیل الاوطار، جلد اول/ ۲۰۷ اور شرح مسلم مقردی، جلد ۳/ ۱۰۵ پر لکھا ہے کہ "یہ حدیث ضعیف ہے"۔

مانیں نہ مانیں جانِ جہاں اختیار ہے
ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے دیتے ہیں

۲ عن قبیعة بن حلب عن ابیه قال کان رسول اللہ یؤمنا فیاخذ شماله بیمینه قبیصه بن حلب

"حلب نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ آنحضرتؐ ہماری امامت کراتے تھے تو آپؐ بائیں ہاتھ کو دائیں ہاتھ سے پکڑتے تھے"۔ (ترمذی، ص ۱۹۰، باب ۱۸۵، حدیث ۲۳۹)

قارئین کرام! آیئے دیکھیں کہ یہ روایت کتنی وثاقت رکھتی ہے:

ا: یہ روایت انتہائی مبہم اور مہمل ہے کیونکہ اس روایت میں یہ بات بیان ہی نہیں کی گئی کہ آنحضرتؐ سینہ پر ہاتھ باندھتے تھے یا ناف پر ہاتھ باندھتے تھے یا ناف کے نیچے ہاتھ باندھتے تھے؟ اگر اسے عملِ پیغمبرؐ سمجھا جائے تو اس کی جگہ کا تعین تو ہونا چاہیے۔

ب: علامہ علی محمد حقانی صاحب اپنی کتاب نبوی نماز (جلد اول/ ۲۴۱-۲۴۲) میں یوں رقم طراز ہیں: اس کی روایت میں سماک بن حرب نے تفرد اختیار کیا ہے اور بہت سے محدثین نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

امام نسائی کہتے ہیں: جب سماک تفرد کرے تو اس کی روایت قابلِ قبول نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اس روایت کی سند میں سفیان ثوری ہے اور اگر یہ روایت صحیح ہوتی

تو کم از کم وہ خود تو اس پر عمل کرتے، جب کہ وہ تو زیر ناف باندھنے کا قائل تھا۔

قارئین کرام! آپ نے دیکھا کہ ایک ہی راوی سے مختلف احادیث اختراع کرائی گئی ہیں۔ ایک ہی راوی ہے کبھی وہ کہتا ہے کہ سینہ پر ہاتھ رکھنے چاہئیں اور کبھی کہتا ہے کہ زیر ناف ہاتھ رکھنے چاہئیں۔ اس تضاد بیانی سے معلوم ہوا کہ یہ حدیث قابل استناد نہیں ہے۔

۳ قال سمعت ابن زبیر یقول صف القدمین و وضع الید علی الید من السنة

"راوی کہتا ہے کہ میں نے ابن زبیر سے یہ سنا کہ قدموں کو برابر رکھنا اور ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھنا سنت ہے"۔

(سنن ابی داؤد، باب ۲۶۹، حدیث ۷۴۹)

الف: ابن زبیر سے یہ روایت صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کا راوی نصر بن علی متہم ہے۔ اس روایت کے اسناد یہ ہیں:

نصر بن علی عن ابی احمد عن العلاء بن صالح عن زرعة بن عبدالرحمٰن قال سمعت ابن الزبیر

ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں: "ابواحمد مجہول ہے اور وہ ناپسندیدہ احادیث بیان کرتا تھا اور زرعہ کے متعلق لکھا ہے کہ اس کی احادیث باطل پر مشتمل ہوتی تھیں۔ اسی وجہ سے لوگ اس کی احادیث قبول نہیں کرتے تھے"۔

ب: یہ حدیث نبوی نہیں ہے، بلکہ ابن زبیر کی ذاتی رائے ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ ابن زبیر کی بھی رائے نہیں ہو سکتی، کیونکہ ہم پہلے روایت صحیح کے مطابق یہ نقل

کر چکے ہیں۔

کان ابن زبیر اذا صلّٰی یرسل یدیہ

"ابن زبیر جب نماز پڑھتے تو ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے تھے"۔

تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: کتاب "ارسال یدین" مؤلفہ سید اظہر علی، طبع لاہور، ص ۴۲، بحوالہ دراسات اللبیب، طبع لاہور، ۱۸۶۸ء، ص ۳۳۰۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس روایت میں ابن زبیر کی طرف غلط بات منسوب کی گئی ہے، کیونکہ جواہر فصیحہ (جلد۲/۲۴۷، طبع حیدرآباد دکن) میں مرقوم ہے کہ جب کسی راوی کا عمل اس کی روایت کے مخالف ہو تو پھر عمل ہی معتبر سمجھا جاتا ہے نہ کہ روایت۔

٭ حدثنا محمد بن بکار بن ریان عن هشیم بن بشیر عن الحاج ابن ابی زینب عن ابی عثمان النهدی عن ابن مسعود انه کان یصلی فوضع یده الیسریٰ علی الیمنٰی فرآه النبی فوضع یده الیمنٰی علی الیسریٰ (سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب ۲۶۹، حدیث ۷۵۰)

"(بحذف اسناد) ابن مسعود نے نماز پڑھی تو بایاں ہاتھ دائیں پر رکھا، نبی اکرمؐ نے اُسے دیکھا تو آپؐ نے اس کے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھا"۔

یہ روایت بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس میں یہ بیان نہیں کیا گیا کہ ہاتھ کہاں باندھے گئے: ناف پر، زیرِ ناف یا سینہ پر؟

ب: اس کا ایک راوی محمد بن بکار ہے جو کہ مجہول ہے۔ سفیان ثوری نے کہا کہ اس سے احادیث نہیں لینی چاہئیں کیونکہ یہ شخص لوگوں کی طرف غلط نسبت دے کر احادیث بیان کرتا تھا۔

اس روایت کے ایک راوی کا نام حجاج ہے۔ امام احمد بن حنبل، ابن مدینی، امام نسائی اور دارقطنی نے اس کے متعلق کہا ہے کہ وہ ثقہ نہیں تھا۔ (میزان الاعتدال)

۞ صحیح بخاری (باب وضع الیمنیٰ علی الیسریٰ، جلد اول/ ۸۷، طبع مصر) میں مرقوم ہے:

(عبداللہ بن مسلمہ عن مالک عن ابی حازم عن سہیل بن سعد) کان الناس یؤمرون......

"یعنی لوگوں کو حکم دیا جاتا تھا کہ نماز میں داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھا کریں"۔

صحیح بخاری کی یہ روایت بھی ہرگز حجت نہیں ہے، کیونکہ:

ا: یہ حدیث نبوی نہیں ہے بلکہ یہ سہل کا ذاتی قول ہے۔

ب: اس کا ایک راوی امام مالک ہے، جب کہ خود امام مالک ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے تھے اور آج تک ان کے پیروکار بھی ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے ہیں۔ جیسا کہ ہم سابقہ صفحات میں اس کی مکمل وضاحت کر چکے ہیں۔

بلوغ المرام ابن حجر عسقلانی کے اُردو ترجمہ شرح علامہ احمد حسن دہلوی میں مرقوم ہے کہ امام مالک سے ہاتھ چھوڑنے کے بارے میں روایت کی گئی ہے۔ چنانچہ ان کے مقلدین انہی کی تقلید میں ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتے ہیں۔

اور محدث عبدالقادر قریشی حنفی لکھتے ہیں: جب راوی کا عمل اس کی روایت کے خلاف ہو تو عمل کو ہی معتبر سمجھا جائے گا نہ کہ روایت کو۔ جواہر مفیہ (جلد۲/ ۲۲۷، مطبوعہ حیدرآباد دکن)

ویسے بھی یہ روایت یُؤمَرُوْنَ کے مجہول الفاظ سے منقول ہے جس کا معنیٰ یہ ہے کہ لوگوں کو حکم دیا جاتا تھا۔

حکم دینے والے کون تھے؟ اس کا روایت میں کہیں نام و نشان نہیں ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہہ کر صفائی دینے کی کوشش کرے کہ اس روایت کے بعد یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں کہ ابوحازم کہتے ہیں کہ جہاں تک ہم جانتے ہیں اس میں رسولؐ اللہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اسی ابہام کا ہم یہ جواب دیں گے کہ یہ ابی حازم کا محض تخمین و ظن ہے کہ سہل نے غالباً حضورؐ کی طرف نسبت دی ہوگی۔ لہٰذا اس طرح کے ماضی شکیہ کے الفاظ کبھی بھی حدیث صحیح کے زمرہ میں نہیں آتے، کیونکہ حدیث کو واضح ہونا چاہیے، ظن و تخمین پر مبنی نہیں ہونا چاہیے۔

⑥ عن وائل بن حجر قال صلیت مع النبی فوضع یدہ الیمنٰی علی الیسریٰ علی صدرہ

''وائل بن حجر کہتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی، آپؐ نے اپنے سینہ پر دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھا''۔ (ابن خزیمہ، جلداول/ ۲۴۳-۴۰۷)

جناب علی محمد صاحب نے اپنی کتاب نبوی نماز (جلداول/ ۲۴۰-۲۴۱) میں اس حدیث کا جو جواب دیا ہے ہم اسے اپنے قارئین کی نذر کرتے ہیں۔ یہ حدیث

تین طریقوں سے منقول ہے:

مصنف ابن ابی شیبہ میں وائل بن حجر کی اس روایت میں علیٰ صدرہ یعنی سینہ پر ہاتھ رکھنے کے الفاظ ہیں۔ لیکن ابن قیم نے اعلام الموقعین (جلد۳/۹) میں فرمایا ہے:

انه لم يقل على صدره غير مؤمن بن اسماعيل

"یعنی مومن بن اسماعیل کے سوا باقی کسی محدث نے علی صدرہ کے الفاظ نہیں کہے"۔

اس کے متعلق امام بخاری کا یہ قول ہے کہ یہ "منکرالحدیث" تھا یعنی غلط سلط احادیث بیان کرتا تھا۔

امام ابوزرعہ کہتے ہیں: مومن بن اسماعیل آخر میں بہت غلطیاں کرتا تھا۔ علاوہ ازیں اس روایت میں ایک راوی سفیان ثوری بھی ہے، جس کا مسلک زیر ناف ہاتھ باندھنا تھا۔ اگر وائل کی روایت صحیح ہوتی تو خود سفیان ثوری اس پر عمل کرتا؟!

وائل بن حجر کی روایت کو بزاز نے بھی نقل کیا ہے۔ اس میں عَلٰی صَدْرِہٖ کی بجائے عند صدرہ (سینہ کے پاس) کے الفاظ ہیں۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ اس خبر کا ایک راوی محمد بن حجر بھی ہے۔ وله مناكير "وہ بہت سی منکر روایات کا راوی ہے"۔

بہرنوع یہ روایت تین طریقوں سے نقل کی گئی ہے۔ ایک میں زیر ناف کا ذکر ہے، دوسری میں مومل بن اسماعیل اور تیسری میں محمد بن حجر جیسے راوی ہیں۔ جب حدیث ہی ناقابلِ اعتماد ہے تو اس سے دلیل کیسے لی جائے؟

واضح رہے کہ علامہ علی محمد صاحب نہ صرف اپنے مکتبِ فکر کے عالم ہیں،

بلکہ اپنے مسلک میں "استاذ العلماء" بھی ہیں۔ اب ہم ان کی کتاب "نبوی نماز" (جلد اول/۲۲۱-۲۲۲) سے سینہ پر ہاتھ باندھنے کی تین روایات نقل کرتے ہیں اور خود ان کی زبانی ان روایات کی حقیقت کو بھی نذر قارئین کرتے ہیں:

◈ علامہ موصوف رقم طراز ہیں:

عن هلب قال رأيت النبي يضع يده على صدره

"ھلب کہتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم کو دیکھا کہ آپؐ نے سینہ پر ہاتھ رکھے"۔ (بحوالہ مسند احمد)

❶ اس روایت کی حقیقت یہ ہے کہ اس میں سماک بن حرب نے تفرد اختیار کیا ہے اور بہت سے محدثین نے اُسے ضعیف قرار دیا ہے۔ امام نسائی کہتے ہیں: جب سماک تفرد اختیار کرے تو اس کی روایت قابلِ دلیل نہیں ہوتی۔

❷ اس روایت کی سند میں سفیان ثوری ہے۔ اگر یہ روایت صحیح ہوتی تو وہ خود اس پر عمل کرتا۔

◈ اس سلسلہ کی ایک اور روایت یہ ہے:

عن طاؤس قال كان النبي يضع يده اليمنٰى على يده اليسرىٰ ثم يشد بينهما على صدره وهو في الصلاة (بحوالہ مراسیل ابی داؤد)

"طاؤس کہتے ہیں: رسولؐ خدا نے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھ کر سینہ پر رکھا جب کہ آپؐ نماز پڑھنے کی حالت میں تھے"۔

اس حدیث کی اصلیت یہ ہے کہ اس کی سند میں یحیٰ ہے جس کے متعلق ماہر علم الرجال موسیٰ بن ہارون نے یہ کہا تھا:

اشھد انه کاذب

"میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ کاذب ہے"۔

وخط ابوداؤد علی حدیثه

"ابوداؤد نے اس کی نقل کی ہوئی حدیث کو حذف کر دیا"۔

اس روایت کا ایک اور راوی عمرو ہے اور اس کے متعلق ابن عدی نے کہا ہے: "منکر الحدیث کہ وہ غلط سلط احادیث بیان کرتا تھا"۔ (جواہر النقی، جلد۲/۳۰)

اس روایت کا ایک راوی "روح" ہے۔ اس کے متعلق ابن حبان فرماتے ہیں:

یروی الموضوعات ولا تحل الروایة عنه

"وہ جھوٹی احادیث نقل کرتا تھا اس سے روایت کرنا حلال نہیں ہے"۔

امام حاکم نے اُسے یہ کہہ کر مسترد کر دیا: لیس بالقوی "وہ قوی راوی نہیں تھا"۔

علامہ راغب رحمانی حدیقۃ الاظہار ترجمہ منتقی الاخبار (جلد اول/۳۶۹) کے حاشیہ میں طاؤس کی روایت کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ مُرسل ہے۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ مُرسل کسے کہا جاتا ہے؟

کتاب فقہ الحدیث کی اصلاحات میں مرقوم ہے کہ "مُرسل ضعیف حدیث کی وہ قسم ہے جس میں کوئی تابعی، صحابی کے واسطہ کے بغیر رسول اللہؐ سے روایت کرے۔

جامع ترمذی (مترجم علامہ غلام محمد صدیقی، ناشر فرید بک سٹال، لاہور، جلد اول/۱۴) میں یہ الفاظ رقم ہیں: مُرسل جس حدیث کی سند کے راوی کو ساقط کر دیا

جائے مثلاً تابعی حضور اکرمؐ سے روایت کرے اور صحابی کو چھوڑ دے۔

قارئین کرام! ہاتھ باندھنے کے لیے علمائے اہلِ سنت کے ہاں صرف یہی احادیث ہیں اور علمائے اہلِ سنت نے ان کے متعلق جو کچھ خود بیان کیا ہے وہ بھی آپؐ نے ملاحظہ فرمایا ہے۔ مذکورہ احادیث میں سے ایک بھی صحیح السند حدیث ایسی نہیں ہے جس سے یہ استدلال کیا جا سکے کہ نماز میں ہاتھ باندھنا سنتِ نبویؐ ہے۔

جب ہاتھ باندھنے کا کوئی حکم موجود ہی نہیں ہے تو ہاتھ کھولنا خود بخود ثابت ہو جاتا ہے کیونکہ ہاتھ کھولنا اصل فطرت ہے اور فطرت کے اثبات کے لیے سوال کرنا ہی صحیح نہیں ہے مثلاً ایک شخص ہاتھ کھول کر چلتا ہے یا ہاتھ کھول کر بیٹھا ہوا ہے تو اس سے کوئی بھی شخص یہ نہیں پوچھے گا کہ تم نے ہاتھ کیوں کھول رکھے ہیں اور اگر ایک شخص چل رہا ہو اور اس نے ہاتھ باندھے ہوئے ہوں یا کوئی شخص ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوا ہو تو ہر دیکھنے والا اس سے پوچھے گا کہ کیوں خیریت تو ہے آپ نے ہاتھ کیوں باندھے ہوئے ہیں؟

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ کھولنے کے لیے دلیل نہیں مانگی جاتی، جب بھی دلیل مانگی جاتی ہے ہاتھ باندھنے کے لیے مانگی جاتی ہے۔

ویسے بھی نماز میں مختلف حالتیں ہوتی ہیں۔ جب کوئی نمازی نیت کر رہا ہوتا ہے تو اس وقت اس کے ہاتھ کھلے ہوتے ہیں اور جب وہ تکبیر تحریمہ کہتا ہے تو ہاتھ کھلے ہوتے ہیں اور جب رکوع کرتا ہے تو ہاتھ کھلے ہوتے ہیں اور جب سجدہ کرتا ہے تو ہاتھ کھلے ہوئے ہیں اور جب وہ تشہد میں بیٹھتا ہے تو ہاتھ کھلے ہوتے ہیں اور جب سلام پڑھتا ہے تو بھی ہاتھ کھلے ہوتے ہیں۔ جب ہر جگہ ہاتھ کھلے ہوتے ہیں تو ہم یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ برادرانِ اسلام! خدارا ہمیں بتائیں جب ہر

جبکہ آپ کے ہاتھ کھلے ہیں تو قیام میں آپ نے کیوں باندھے ہیں؟

آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

اب اگر کوئی دوست یہ کہے کہ یہ سنتِ رسولؐ ہے تو ہم کتب اہلِ سنت سے ہی ثابت کر چکے ہیں کہ یہ عملِ رسولؐ نہیں ہے۔

اسی لیے ہم اپنے معزز و محترم بھائیوں کو دعوتِ انصاف دیتے ہیں کہ خدارا نماز جیسے فریضہ پر رحم کریں اور اس معراجِ مومن کو خودساختہ رسومات سے آلودہ نہ کریں۔ مزید تسلی کے لیے فتاویٰ مولانا عبدالحی مبوب باب سنن الصلاۃ ص ۲۲۰ پر موجود اس سوال اور اس کے جواب کو ملاحظہ فرمائیں۔ مولانا صاحب سے یہ سوال کیا گیا اور مولانا صاحب نے اس کا یہ جواب تحریر کیا:

سوال: مردوں کے لیے زیرِ ناف اور عورتوں کے لیے زیرِ سینہ ہاتھ رکھنے کا کیا ثبوت ہے؟

جواب: عورتوں کے لیے زیرِ ثدیین (پستانوں کے نیچے) ہاتھ رکھنے کے لیے کوئی حدیث نظر سے نہیں گزری۔ فقہاء نے عورتوں کے لیے اس طریقہ کو ستر کے لیے تجویز کیا ہے۔

شرح منیہ میں ہے:

واما المرأة فانها تضعها تحت ثدييها بالاتفاق لانها استرلها انتهى

"یعنی اس بات پر اتفاق ہے کہ عورتوں کو اپنے ہاتھ پستانوں کے نیچے رکھنے چاہییں کیونکہ یہ طریقہ اس کے لیے زیادہ ستر کا ذریعہ ہے"۔

اور مردوں کے لیے زیر ناف ہاتھ رکھنا فقہاء کے یہاں مسنون ہے۔ اس سلسلہ میں ابوداؤد حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں:

السنة وضع الاكف ويضعها تحت السرة

''سنت یہ ہے کہ ہاتھ باندھے جائیں اور ناف کے نیچے رکھے جائیں''۔

یہی حدیث دوسری جگہ آتی ہے:

السنة وضع الاكف على الكف ويضعها تحت السرة

''سنت یہ ہے کہ ہاتھوں کو باندھا جائے اور ناف کے نیچے رکھا جائے''۔

لیکن امام نووی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ شرح منیہ میں ہے:

قال النووی اتفقوا علٰی تضعیفه لانه من رواية عبدالرحمٰن بن اسحٰق الواسطی وهو مجمع على ضعفه

''امام نووی کہتے ہیں کہ اس روایت کے ضعیف ہونے پر علماء کا اتفاق ہے کیونکہ یہ عبدالرحمٰن بن اسحاق واسطی کی روایت ہے اور اس کے ضعف پر علماء کا اجماع ہے''۔

اور بحرالعلوم مولانا عبدالعلی رسائل الارکان میں فرماتے ہیں کہ شیخ ابن الہمام کا قول ہے:

لم يثبت حديث صحيح يوجب العمل فى كون الوضع تحت الصدر وفى كونه تحت السرة فيحال على حال قصد التعظيم فى القيام والمعهود هو كونه

تحت السرة

''ایک بھی حدیث صحیح ایسی موجود نہیں ہے کہ جس سے سینے کے نیچے یا ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کا اثبات ہوتا ہو، لہٰذا ہاتھ باندھنے کا عمل تعظیم کے لیے ہے اور لوگوں کی عادت یہ ہے کہ وہ ناف کے نیچے ہاتھ باندھتے ہیں''۔

فتاویٰ عبدالحی ترجمہ مولانا خورشید عالم صاحب، صاحب فاضل دیوبند، ناشر قرآن محل مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی نمبر۱

علمائے اہلِ سنت خود یہ فرماتے ہیں کہ ہاتھ باندھنے کے لیے ان کے ہاں کوئی بھی حدیث صحیح موجود نہیں ہے بس یہ ایک عوامی چلن ہے جس پر وہ عمل کر رہے ہیں۔ جہاں تک قرآن کریم کا تعلق ہے تو اس میں اشارۃ النص کے تحت ہاتھ کھولنے کا ثبوت بیان کیا جا سکتا ہے، مثلاً ارشاد خداوندی ہے:

وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ (سورۂ نساء، آیت ۱۰۲)

''اے نبیؐ! جب تم مسلمانوں کے درمیان ہو اور انھیں نماز پڑھانے کھڑے ہو تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ تمھارے ساتھ کھڑا ہو اور چاہیے کہ وہ اپنا اسلحہ پکڑے رہیں''......

اس آیتِ مجیدہ کا تعلق نمازِ خوف سے ہے۔ جب جنگ جاری ہو اور وقتِ نماز آ جائے تو حکمِ خداوندی یہ ہے کہ مجاہدین کے دو گروہ بنائے جائیں۔ ایک گروہ لڑتا رہے اور دوسرا گروہ آ کر نماز میں شامل ہو جائے، جو گروہ نماز میں شامل ہو اُن کے لیے حکمِ قرآن یہ ہے کہ وہ اپنے ہتھیار اُٹھا کر نماز پڑھیں۔

اگر حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں نماز ہاتھ باندھ کر پڑھنے کا رواج ہوتا تو خدا یہ حکم کیسے دیتا کہ مجاہد اپنے ہتھیار ہاتھوں میں لے کر نماز پڑھیں۔

جب کہ کسی چیز کے اُٹھانے اور پکڑنے کے لیے ہاتھوں کا کھلا ہونا ضروری ہے۔ سیدھی سی بات ہے اگر کسی کے ہاتھ باندھ دیے جائیں تو وہ تو کچھ بھی نہیں اُٹھا سکتا۔ کسی چیز کا اُٹھانا دلیل ہے کہ اُٹھانے والے کے ہاتھ کھلے ہیں، لہٰذا مجاہدین کو یہ حکم دینا کہ وہ اپنے ہتھیار اُٹھا کر نماز پڑھیں۔ یہ اس بات کی مضبوط ترین دلیل ہے کہ رسول اکرمؐ کی زندگی میں نماز ہاتھ کھول کر پڑھی جاتی تھی۔

ہاتھ کھول کر نماز پڑھنے والے

امام ابوبکر بن شیبہ نے اپنی کتاب "المصنف" میں ایک پورا باب قائم کیا ہے اور اس باب کا یہ عنوان مقرر کیا:

من كان يرسل يديه فى الصلاة

"نماز میں ہاتھ کھولنے والے افراد"۔

ہم ذیل میں ان کی کتاب سے چند اقتباسات نقل کرتے ہیں:

1 حدثنا هيثم عن يونس عن الحسن ومصرة عن ابراهيم انهما كانا يرسلان ايديهما فى الصلاة

"بیان کیا ہیثم نے یونس سے، اُس نے حسن اور مصرہ سے اور ابراہیم سے روایت کی ہے کہ وہ دونوں (یعنی حسن و ابراہیم) ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے تھے"۔

2 حدثنا عفان ثنا یزید بن ابراهیم سمعت عمرو بن دینار، کان ابن الزبیر اذا صلّی یرسل یدیه
''ہم سے عفان نے بیان کیا، اس سے یزید بن ابراہیم نے بیان کیا۔ اس نے کہا کہ میں نے عمرو بن دینار سے سنا کہ ابن زبیر جب نماز پڑھتے تو ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے تھے''۔

3 عن ابن سیرین انه سئل عن الرجل یمسك یمینه بشماله قال انما فعل ذٰلك من اجل الدم
''ابن سیرین سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی شخص دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کو پکڑتا ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟ ابن سیرین نے کہا کہ ایسا عمل خون کی وجہ سے کرسکتا ہے''۔

مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی شخص طویل قیام کر رہا ہو اور ہاتھوں کو لٹکائے اس کی انگلیوں میں خون اُتر آئے تو اس حالت میں ہاتھ باندھ سکتا ہے۔

4 قال عبد الله ما رأیت ابن المسیب قابضا یمینه فی الصلاة کان یرسلهما
''عبداللہ راوی ہیں کہ میں نے ابن مسیب کو کبھی بھی نماز میں ہاتھ باندھ کر نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے تھے''۔

5 عبداللہ راوی ہیں کہ میں ایک دفعہ سعید بن جبیر کے ساتھ طواف کر رہا تھا۔ انھوں نے ایک شخص کو دیکھا جو دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھ کر نماز پڑھ رہا تھا تو وہ اس کے پاس گئے اور اس کے دونوں ہاتھوں کو جدا کر دیا۔ پھر واپس آ گئے۔

(کتاب المصنف ابن ابی شیبہ، ص ۲۳۶-۲۳۷)

● کان عبداللّٰہ بن زبیر اذا صلّٰی یرسل یدیہ

"عبداللہ بن زبیر ہمیشہ ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے تھے"۔

(دراسات اللبیب، ص ۳۴۰)

واضح رہے کہ یہ عبداللہ بن زبیر حضرت زبیر کے بیٹے اور حضرت ابوبکر کے نواسے ہیں۔ ان کی والدہ اسماء بنت ابی بکر تھیں اور انھوں نے اُم المومنین عائشہ کی گود میں پرورش پائی تھی۔ اور جنگِ جمل میں اپنے والد کے ساتھ شامل ہوئے تھے اور یزید بن معاویہ کے دور میں اُنھوں نے مکہ پر حکومت قائم کی تھی اور مرگِ یزید کے ساتھ اس میں توسیع پیدا ہوئی تھی اور قریباً دس سال تک اُنھوں نے حکومت کی تھی اور خانہ کعبہ میں نماز پڑھاتے تھے اور مکہ میں مقیم صحابہ و تابعین اُن کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، لیکن کسی بھی صحابی اور تابعی نے ان کی نماز پر اعتراض نہیں کیا تھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عالمِ اسلام میں ہاتھ کھولنے کا عمل رائج تھا اور عبداللہ بن زبیر کی نماز رسولِ مقبول کی نماز کا عکس شمار کی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عبداللہ بن عباس نے یہ جملے کہے تھے:

ان احببت ان تنظر الی صلاۃ رسول اللّٰہ فاقتد بصلاۃ عبداللّٰہ بن الزبیر

"اگر تم رسولؐ کی نماز دیکھنا چاہتے ہو تو عبداللہ بن زبیر کی نماز کی پیروی کرو"۔ (سنن ابوداؤد، جلد اول، باب افتتاح الصلاۃ، حدیث ۷۳۴، ص ۲۹۵، پارہ ۵)

مذکورہ روایات کے علاوہ مختلف کتابوں میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاری،

عمران بن حصین، ابوسعید خدری، زید بن ارقم، حجر بن عدی، سلیم بن قیس، مالک بن اشتر اور عدی بن حاتم کے متعلق بھی مذکور ہے کہ یہ حضرات نماز ہاتھ کھول کر پڑھتے تھے۔

یہ صحابہ کرام خلفائے راشدین کے دور کے بعد کافی عرصہ تک زندہ رہے۔

صحابہ کرام کے بعد تابعین اور تبع تابعین کی ایک جماعت بھی اس پر عمل پیرا رہی۔ مذکورہ روایات کا فرداً فرداً نقل کرنا ممکن نہیں ہے۔ ہم اختصار کے پیش نظر صرف ان بزرگواروں کے ناموں پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

تابعینِ عظام

حضرت علقمہ بن قیس بن عبداللہ، سعید بن مسیب، عروہ بن زبیر، محمد بن حضرت ابوبکر، عمرو بن دینار، ابراہیم نخعی، سلمان بن یسار، سعید بن جبیر، حبیب بن ابی ثابت، حکم بن عتیبہ، یحییٰ بن سعید القطان، ابراہیم بن مالک، علی بن زید جدعان، عبداللہ بن متی، سلیمان بن مہران، محمد بن سیرین، ابان بن تغلب، ابراہیم بن عمرو، حارث بن عبداللہ، علی بن صالح اور یحییٰ ابن جزار وغیرہ۔

یہ تابعین عظام وہ ہیں جن کے متعلق مختلف کتابوں میں ہاتھ کھولنے کی روایات موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اور بیسیوں تابعینؒ ہوں گے جو اس پر عمل کرتے ہوں گے۔

تبع تابعین

حضرت اسماعیل بن ابان، اسماعی بن خلیفہ، اسماعیل بن زکریا، اسماعیل بن عبدالرحمٰن، تالید بن سلیمان، ثابت بن دینار، جابر بن یزید، جعفر بن زید، حبیب بن ابی ثابت، حسن بن صالح، زبید بن حارث، سلمہ بن کہیل، عبدالرزاق بن ہمام اور

محمد بن حازم وغیرہ۔ ان حضرات کے متعلق روایات کتابوں میں مرقوم ہیں۔

ائمہ اہلِ بیتؑ کا قول و فعل

امام شوکانی نے نیل الاوطار (طبع مصر، جلد۲/۷۶) میں یہ اعتراف کیا ہے کہ عترت رسولؐ ہاتھ کھول کر نماز پڑھنے کی قائل ہے۔ اس کی تصدیق مذہب شیعہ کی ان مستند روایات سے ہوتی ہے۔

فقام ابو عبداللّٰه علیه السلام مستقبل القبلة فارسل یدیه جمیعا قد ختم اصابع مفرجات واستقبل باصابع رجلیه جمیعا الی القبلة لم یحرفها عن القبلة ثم قال اللّٰه اکبر بخشوع......

"امام جعفر صادق علیہ السلام حماد کو نماز سکھانے کے لیے کھڑے ہوئے اور دونوں ہاتھ چھوڑ کر دونوں رانوں پر رکھے اور ان کے درمیان تین کھلی انگلیوں کا فاصلہ رکھا اور خشوع سے اللہ اکبر کہا"۔

پھر سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص (قل هو اللّٰه احد) پڑھی، پھر سانس لینے کی دیر تک توقف کیا۔ اس دوران آپؑ کھڑے رہے۔ پھر آپؑ نے چہرے تک ہاتھ اُٹھائے اور بحالت قیام اللہ اکبر کہا۔

اس حدیث میں حضرتؑ کی پوری نماز کی عکاسی کی گئی ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں: فروع کافی کتاب الصلاۃ، جلد اول، باب ۱۹، حدیث ۶)

ایک اور روایت ملاحظہ فرمائیں:

عن ابی جعفر قال اذا قمت فی الصلاۃ فلا تلصق قدمک بالاخریٰ دع بینھما فصلا اصواقل ذٰلک شبر او اکثر واسدل فکبیک وارسل یدیک ولا تشبک اصابعک ولیکونا علی فخذیک قبالۃ رکبتیک

”امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: جب تو نماز کے لیے اُٹھے تو قدموں کو ایک دوسرے سے نہ ملانا اور اپنے قدموں کے درمیان ایک بالشت یا اس سے کچھ زیادہ فاصلہ رکھنا اور اپنے دونوں کندھوں کو برابر سیدھا رکھنا اور اپنے دونوں ہاتھ کھول دو اور اپنی اُنگلیوں میں انگلیاں مت ڈالو۔ دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں کے سامنے اپنی رانوں پر رکھو۔ (فروع کافی، کتاب الصلاۃ، باب ۲۷، حدیث اول)

تہذیب الاحکام اور دعائم الاسلام میں امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام سے بھی ہاتھ کھولنا منقول ہے۔ من لایحضرہ الفقیہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی ہاتھ کھولنا منقول ہے۔

علاوہ ازیں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی مکمل نماز مستدرک الوسائل، جلد اول، کتاب الصلاۃ باب کیفیتھا وجملۃ من احکامھا وآدابھا حدیث اول میں موجود ہے اور اس میں ہاتھ کھول کر نماز پڑھنے کی روایت کی گئی ہے۔

رسولؐ خدا کی قولی اور ابوحمید ساعدی کی فعلی حدیث

اس موضوع پر اگرچہ ہم بہت زیادہ دلائل پیش کرچکے ہیں، لیکن تکمیلِ بحث

کے لیے ہم حسب ذیل روایات نقل کرتے ہیں۔ سب سے پہلے ہم آنحضرت خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک قولی حدیث پیش کرتے ہیں، آنحضرتؐ نے فرمایا:

لا یتیم صلاۃ احدکم حتّٰی یسبغ الوضوء کما امرہ اللّٰہ فیغسل وجھہ ویدیہ الی المرفقین ویمسح رأسہ ورجلیہ الی الکعبین ثم یکبر اللّٰہ ویحمدہ ویمجدہ ویقرأ ما تیسر من القرآن مما علمہ اللّٰہ واذن لہ فیہ ثم یکبر فیرکع فیضع کفیہ علی رکبتیہ فیرفع حتّٰی تطمئن مفاصلہ وتسترخی ثم یقول سمع اللّٰہ لمن حمدہ فیستوی قائما حتّٰی یاخذ کل عظیم ماخذہ ویقیم صلبہ ثم یکبر فیسجد فیمکن جبھتہ من الارض حتّٰی تطمئن مفاصلہ وتسترخی ثم یکبر فیرفع رأسہ فیستوی قاعدا علی مقعدتہ ویقیم صلبہ ثم یکبر فیسجد حتّٰی یکمن وجھہ ویرفع یدیہ عند کل تکبیر ویسترخی لا صلاۃ احدکم حتّٰی یفعل ذٰلک

''اس وقت تک کسی شخص کی نماز مکمل نہیں ہو سکتی، جب تک وہ پورا وضو نہ کرے اور اس طرح سے وضو نہ کرے جیسا کہ خدا نے اُسے حکم دیا ہے۔ اپنے منہ کو دھوئے، پھر دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوئے پھر اپنے سر اور پاؤں کا ٹخنوں تک مسح

کرے۔ پھر تکبیر کہہ کر خدا کی حمد و تمجید بجا لائے۔ پھر جتنا خدا نے اُسے قرآن کی تعلیم دی ہے اس کے مطابق جتنا آسانی سے قرآن پڑھ سکتا ہے پڑھے۔ پھر تکبیر کہہ کر رکوع میں جائے اور دونوں ہتھیلیاں اپنے گھٹنوں پر رکھے۔ پھر سیدھا کھڑے ہوکر سمع اللہ لمن حمدہ کہے۔ پھر سیدھا کھڑے ہوکر تکبیر کہے اور سجدہ میں جائے اور اپنی پیشانی کو خاک پر رکھے اور ہر تکبیر پر رفع یدین کرے۔ الغرض جب تک ان سب باتوں پر عمل نہ کیا جائے اس وقت تک کسی کی نماز درست نہیں ہوگی"۔

(ملاحظہ فرمائیں متقی ہندی کی کتاب کنز العمال، جلد۴/۹۳)

تبصرہ: اس حدیث میں رسولؐ خدا نے نماز کی تمام جزئیات بیان فرمائیں۔ رفع یدین سے لے کر قیام، رکوع وسجود تک سب باتوں کا تذکرہ فرمایا لیکن آپ نے ہاتھ باندھنے کا ذکر نہیں کیا۔

آیئے غور وفکر کریں کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز میں دونوں ہاتھ اپنی فطری حالت پر رکھے جاتے تھے اسی لیے آنحضرتؐ نے اس کا ذکر نہیں کیا اور اگر بالفرض آنحضرتؐ کی حیاتِ طیبہ میں ہاتھ باندھنے کا رواج ہوتا تو رسولؐ خدا بھی اس جانب کوئی نہ کوئی اشارہ ضرور فرماتے۔

ابوحمید ساعدی کی اصولی وفعلی حدیث

قارئین کرام! آپ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قولی حدیث پڑھی۔ اب جامع ترمذی اور سنن ابوداؤد سے آپ کی فعلی حدیث پیش کرتے ہیں

اور یہ اکیلی حدیث گیارہ احادیث کے برابر وزنی ہے، کیونکہ اس حدیث میں ایک صحابی نے دس دوسرے صحابیوں کی موجودگی میں اپنی نماز پڑھ کر دکھائی اور کہا کہ یہ رسول اکرمؐ کی نماز ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ دس صحابیوں نے اُس کی تصدیق کی اور کہا کہ واقعی یہ نماز رسولؐ ہے۔

علماء ومحدثین کے ہاں یہ حدیث انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ امام ابن خزیمہ جو کہ امام بخاری کے استاد تھے اُنھوں نے اس حدیث کے متعلق کہا تھا کہ یہ حدیث ایک اصولی بیان کی حیثیت رکھتی ہے۔ (کما فی صحیح ابن خزیمة)

اس حدیث میں جہاں بہت سی باتیں قابلِ غور ہیں وہاں ہاتھوں کی پوزیشن بھی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ اکیلی حدیث گیارہ احادیث کے برابر ہے، اس لیے ہم اس کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔ یہ الفاظ کتبِ خلافت کی مستند ترین کتاب سنن ابی داؤد کے ہیں اور ترجمہ علامہ وحید الزمان کا ہے:

حدثنا احمد بن حنبل ناابوعاصم الضحاك بن مخلد حدثنا مسددنا یحییٰ وھذا حدیث احمد قال حدثنا عبدالحمید یعنی ابن جعفر اخبرنی محمد بن عمرو بن عطاء قال سمعت ابا حمید الساعدی فی عشرة من اصحاب رسول الله منھم ابوقتادہ قال ابوحمید انا اعلمکم بصلاة رسول الله (ص) قالوا فلم فوالله ما کنت باکثر ناله بتعا ولا اقدمنا له صحبة قال بلیٰ قالوا فاعرض قال کان رسول الله اذا قام الی الصلاة یرفع یدیه حتیٰ یحاذی بھا

منکبیه ثم کبر حتٰی یقر کل عظم فی موضعه معتدلا ثم یعرأ ثم یکبر فیرفع یدیه حتٰی یحاذی بها منکبیه ثم یرکع ویضع راحتیه علی رکبتیه ثم یعتدل فلا ینصب رأسه ولا یقنع ثم یرفع رأسه فیقول سمع الله لمن حمده ثم یرفع یدیه حتٰی یحاذی منکبیه معتدلا ثم یقول الله اکبر ثم یهوی الی الارض فیجا فی یدیه عن جنبیه ثم یرفع رأسه ویثنی رجله الیسریٰ ویقعد علیها ویفتح اصابع رجلیه اذا سجد ثم یسجد ثم یقول الله اکبر ویرفع ویثنی رجله الیسریٰ فیقعد علیها حتٰی یرجع کل عظم الی موضعه ثم یصنع فی الاخریٰ مثل ذٰلك ثم اذا قام من الرکعتین کبر ورفع یدیه حتٰی یحاذی بها منکبیه کما کبر عند افتتاح الصلاۃ ثم یصنع فی بقیة صلاته حتٰی اذا کانت السجدۃ التی فیها التسلیم اخر رجله الیسریٰ وقعد متورکا علی شقه الایسر قالوا صدقت هکذا کان یصلی

”(بحذف اسناد) ابوحمید ساعدی سے روایت ہے کہ وہ دس صحابیوں میں بیٹھے ہوئے تھے ان میں ابوقتادہ بھی تھے۔ ابوحمید نے کہا: میں تم سب سے زیادہ رسولؐ اللہ کی نماز کو جانتا ہوں۔ لوگوں نے کہا: وہ کیونکر؟ خدا کی قسم، تم نے ہم سے زیادہ رسولؐ

خدا کی نہ تو پیروی کی تھی اور نہ ہی ہم سے پہلے آپ کی صحبت میں آئے تھے۔ابوحمید نے کہا: ہاں یہ ٹھیک ہے۔ ان لوگوں نے کہا: اچھا بیان کرو۔

ابوحمید نے کہا: رسولؐ اللہ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو دونوں ہاتھ اُٹھاتے اپنے مونڈھوں (کندھوں) تک پھر تکبیر کہتے۔ اور جب ہر ہڈی اپنے اپنے مقام پر آجاتی اعتدال سے تو آپ قرأت شروع کرتے، پھر تکبیر کہتے اور دونوں ہاتھ اُٹھاتے مونڈھوں تک پھر رکوع کرتے اور دونوں ہتھیلیوں کو اپنے اپنے گھٹنوں پر رکھتے تھے اور پیٹھ سیدھی کرتے نہ جھکاتے، نہ اُونچا رکھتے (سر کو پیٹھ کے برابر رکھتے) پھر سر اُٹھاتے اور فرماتے: سمع اللہ لمن حمدہ۔ پھر دونوں ہاتھ اُٹھاتے، اپنے مونڈھوں تک سیدھے کھڑے ہوکر پھر اللہ اکبر کہتے اور زمین کی طرف جھکتے تو دونوں ہاتھوں کو اپنے پہلوؤں سے جدا رکھتے۔ پھر اُٹھاتے اپنا سر سجدے سے اور بائیں پاؤں کو بچھا کر اس پر بیٹھتے اور سجدہ کے وقت انگلیوں کو کھلا رکھتے، پھر دوسرا سجدہ کرتے، اللہ اکبر کہہ کے پھر سر اُٹھاتے سجدے سے اور بائیں پیر کو بچھا کر اس پر بیٹھتے۔ اتنی دیر کہ ہر ہڈی اپنے ٹھکانے پر آجاتی اور دوسری رکعت میں ایسا ہی کرتے۔ پھر جب دو رکعتوں سے فارغ ہوکر کھڑے ہوتے، اللہ اکبر کہتے اور دونوں ہاتھ اُٹھاتے مونڈھوں تک جیسا کہ شروع نماز کے

وقت اُٹھاتے تھے۔ پھر باقی نماز میں ایسا ہی کرتے، یہاں تک کہ جب آخری سجدے سے فارغ ہوتے جس کے بعد سلام ہوتا ہے تو نکالتے بایاں پاؤں اپنا اور بیٹھتے بائیں کولہے پر۔

صحابہ نے یہ سن کر کہا: صدقت هكذا كان يصلى۔ ''تم نے سچ کہا اسی طرح رسولؐ خدا نماز پڑھتے تھے''۔ (حوالے کے لیے ملاحظہ فرمائیں سنن ابوداؤد، جلد اول/۲۹۱، پارہ ۵۔ باب افتتاح الصلاۃ۔ حدیث ۷۲۵، طبع لاہور۔ جامع ترمذی، جلد اول/۱۷۴۔ ابواب الصلاۃ، باب ماجاء فی وصف الصلاۃ (یعنی کیفیت نماز کا باب) صحیح بخاری، جلد اول/۳۸۵، کتاب الصلاۃ، باب ۵۳۶، حدیث ۷۸۷، طبع لاہور)

حدیث پر مختصر تبصرہ

سنن ابی داؤد کی مندرجہ بالا حدیث میں ایک صحابی نے رسولؐ اللہ کی نماز کا ہر ہر عمل دس دوسرے صحابہ کے سامنے بیان کیا ہے۔ آنحضرتؐ کی نماز کے ابتدائی حصے پر توجہ فرمائیں:

اذا قام للصلاة يرفع يديه حتى يحاذى بهما منكبيه ثم كبر حتى يقر كل عظم فى موضعه معتدلا ثم يقرأ

''جب رسولؐ خدا نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو دونوں ہاتھ اُٹھاتے اپنے کاندھوں تک پھر تکبیر کہتے پھر جب ہر ہڈی اپنے مقام پر آجاتی اعتدال سے تو آپ قرأت شروع کرتے تھے''۔

یعنی رسولؐ خدا تکبیر تحریمہ کے بعد اپنے جسم کے اعضاء کو فطری حالت پر چھوڑ دیتے اور جب ہر ہڈی اپنے مقام پر آ جاتی تو پھر قرأت شروع کرتے تھے۔

یہ حدیث اپنے مقام پر زبانِ حال سے چیخ چیخ کر یہ کہہ رہی ہے کہ آنحضرتؐ تکبیر تحریمہ کے بعد ہاتھوں کو کھلا چھوڑ دیتے تھے، کیونکہ ہاتھوں کی فطری حالت یہی ہوتی ہے۔

حدیث کی اہمیت

امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن اور صحیح قرار دیا ہے اور محدثین کے نزدیک اس کی اتنی زیادہ اہمیت ہے کہ ابن خزیمہ کے بقول کہ یہ حدیث ایک اصولی تفصیلی بیان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس حدیث کو ہر محدث نے اپنی اپنی کتابوں میں کہیں تفصیل سے تو کہیں اختصار سے نقل کیا ہے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح کی جلد اول میں پانچ سے زیادہ بار اُسے نقل کیا ہے اور امام مسلم اور امام ابن خزیمہ نے بھی اپنی اپنی صحیح میں اسے متعدد مقامات پر نقل کیا ہے۔

دس صحابہ کرام کی تصدیق

امام ابوداؤد نے اس محفل میں موجود صحابہ کرام میں سے کچھ کے نام تحریر کیے ہیں۔ ان میں حضرت ابوحمید اور ابوقتادہ کے علاوہ حضرت سہل بن سعد، ابو اسید اور محمد بن مسلم شامل تھے اور امام ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں حضرت سہل بن سعد، ابی حمید، محمد بن مسلم، ابوہریرہ اور ابوقتادہ کے نام تحریر کیے ہیں، جب کہ دیگر کتابوں میں اس محفل میں موجود صحابہ کرام کے یہ نام بیان کیے گئے ہیں:

(۱) حضرت ابوہریرہ (۲) سہل بن سعد (۳) ابوقتادہ (۴) زید (۵) عبداللہ بن

عمر ⑥ ابو موسیٰ ⑦ ابو سعید ⑧ اُم المومنین بی بی عائشہ ⑨ محمد بن مسلم ⑩ ابو اسید ⑪ ابو حمید ساعدی

اس حدیث کے راوی ابو عاصم نے عبدالحمید بن جعفر کے واسطہ سے محمد بن عمرو سے روایت کیا ہے کہ اس محفل میں موجود تمام صحابہ نے ابو حمید ساعدی کی تصدیق کرتے ہوئے یہ جملہ کہا تھا:

صداقت هكذا كان يصلّي

"تو نے سچ کہا ہے رسولؐ خدا اسی طرح سے ہی نماز پڑھا کرتے تھے"۔

صحابہ نے ابو حمید ساعدی کی تصدیق کی اور یہ کہا: كان يصلّي۔ گرائمر کے اعتبار سے یہ الفاظ استمرار و دوام پر دلالت کرتے ہیں۔ یعنی رسول اللہؐ ہمیشہ سے اسی طرح سے ہی نماز پڑھتے تھے۔

امام ابو داؤد نے اس حدیث کو دو طریق سے نقل کیا ہے۔ پہلی سند میں امام احمد بن حنبل، ابو عاصم، ضحاک بن مخلد اور دوسری سند میں مسدد، یحییٰ، عبدالحمید بن جعفر، محمد بن عمرو بن عطاء، ابو حمید ساعدی ہے۔ جس سے اس حدیث کی مزید تائید ہوتی ہے۔

اہلِ انصاف سے درخواست ہے کہ وہ اس حدیث کو بار بار پڑھیں۔ اس کو ایک صحابی نے بیان کیا ہے اور دس صحابہ کرام نے اس کی تصدیق کی ہے۔ اس میں کہیں بھی حالتِ قیام میں ہاتھ باندھنے کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے۔ اگر آنحضرتؐ نماز میں ہاتھ باندھتے ہوتے تو ابو حمید ساعدی اسے ضرور بیان کرتا، کیونکہ یہ تو ایک ایسا عمل ہے جسے بخوبی دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا صحابی کا اسے بیان نہ کرنا

اس بات کا ثبوت ہے کہ آنحضرتؐ نے کبھی بھی ہاتھ باندھ کر نماز نہیں پڑھی تھی۔

اکثریتی فیصلہ اور اقلیتی فیصلہ

جب بھی کسی ملک میں کوئی بڑا سنگین واقعہ ہوتا ہے تو اس کی تحقیقات کے لیے حکومت سپریم کورٹ کے ججز کا ایک بنچ قائم کرتی ہے مثلاً کسی واقعہ کی تحقیق کے لیے حکومت نے اگر نو ججز متعین کیے ہوں اور فیصلہ کے وقت پانچ ججز ایک فیصلہ لکھیں اور چار ججز دوسرا فیصلہ لکھیں تو ہمیشہ اکثریتی فیصلہ کو ترجیح دی جاتی ہے اور اقلیتی فیصلہ پر عمل درآمد نہیں کیا جاتا۔

اب نماز میں ہاتھ کھولنے اور باندھنے کے مسئلہ کے متعلق بھی ہم اسلام کے عظیم ججز کا فیصلہ دیکھتے ہیں۔ عالمِ اسلام میں مشہور ترین ججز کی کل تعداد سولہ ہے۔ ان میں سے بارہ امام شیعوں کے ہیں اور چار امام برادرانِ اہلِ سنت کے ہیں اور یوں ان کی کُل تعداد سولہ افراد بنتی ہے۔

اب دیکھیں کہ فقہ اسلامی کے ان سولہ محترم ججز کا اکثریتی فیصلہ کیا ہے اور اقلیتی فیصلہ کیا ہے؟

فقہ اسلامی کے ان سولہ محترم ججز میں سے تیرہ ججز کا متفقہ فیصلہ ہے کہ نماز ہاتھ کھول کر پڑھنی چاہیے۔ مقصد یہ ہے کہ اہلِ بیتؑ کے بارہ ائمہ کا فیصلہ ہے کہ نماز ہاتھ کھول کر پڑھنی چاہیے اور مکتبِ خلافت کے چار ججز میں سے امام مالک کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ نماز ہاتھ کھول کر پڑھنی چاہیے۔

جب کہ تین ججوں کا فیصلہ ہے کہ نماز ہاتھ باندھ کر پڑھنی چاہیے، لیکن خود ان میں بھی اتفاق نہیں ہے۔ ان میں سے ایک امام کہتے ہیں کہ نماز میں سینہ پر

ہاتھ باندھے جائیں اور دوسرے امام کہتے ہیں کہ ناف کے اُوپر ہاتھ باندھے جائیں۔ تیسرے امام کا فرمان ہے کہ ناف کے نیچے ہاتھ باندھے جائیں۔

تیرہ ججوں کا مکمل اتفاق ہے کہ نماز میں ہاتھ کھولے جائیں اور تین ججوں نے اختلافی نوٹ لکھا ہے کہ ہاتھ باندھے جائیں۔ تیرہ میں مکمل اتفاق ہے اور تین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ قانون اور عقل کا تقاضا یہی ہے کہ اس مسئلہ میں تین ائمہ کے بجائے تیرہ ائمہ کے فتویٰ پر عمل کیا جائے۔ ویسے بھی ہر شخص نے قیامت کے دن خدا کے حضور پیش ہونا ہے۔ اگر مالک الملک نے ہمارے کسی سُنّی بھائی سے پوچھ لیا کہ بتاؤ نماز پڑھی تھی؟

وہ اگر مکمل نمازی ہے تو عرض کرے گا: خدایا! جی ہاں میں نے پوری زندگی نماز کی پابندی کی تھی۔

اب خدا پوچھے گا کہ بتاؤ نماز تو پڑھی، لیکن کس طریقہ سے پڑھی؟

اس کے جواب میں سُنّی بھائی عرض کرے گا: خدایا! میں نے ہاتھ باندھ کر فقہ حنفی کے مطابق نماز پڑھی تھی۔

اب خدا نے فیصلہ کرنا ہے۔ آوازِ قدرت آئے گی کہ بلاؤ ابوحنیفہ کو۔

ابوحنیفہ کتنے ہی صاحبِ عزت کیوں نہ ہوں پھر بھی وہ خدا کے بندے ہیں۔ وہ حاضر ہوں گے تو خدا فرمائے گا کہ تم نے ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنے کا جو حکم دیا تھا کیا تم نے میرے رسول کی نماز دیکھی تھی؟

وہ عرض کریں گے: نہیں خدایا! میں نے تیرے حبیب کی نماز نہیں دیکھی تھی، کیونکہ تیرے حبیبؐ نے ۱۱ ہجری میں وفات پائی تھی اور میں ۸۰ ہجری میں پیدا ہوا تھا۔ تیرے حبیب کی زندگی مکہ و مدینہ میں بسر ہوئی تھی جب کہ میری زندگی کوفہ و

بغداد میں گزری تھی۔ تیرے حبیب کا تعلق قبیلہ قریش کی ذیلی شاخ بنی ہاشم سے تھا، جب کہ میرا تعلق عجم کے ایک خاندان کے ساتھ تھا۔

اب اگر یہی مسئلہ رب العزت ایک شیعہ مسلمان سے کرے کہ کیا تو نے نماز پڑھی تھی؟ اگر وہ مکمل نمازی ہے تو عرض کرے گا: جی ہاں، خدایا! میں نے نماز پڑھی تھی۔

اب خدا اس سے پوچھے گا کہ بتا تو نے نماز کیسے پڑھی تھی؟

شیعہ مسلمان عرض کرے گا: خدایا! میں نے حضرت علیؑ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہاتھ کھول کر نماز پڑھی تھی۔

خداوند عالم فرمائے گا کہ علی بن ابی طالبؑ کو ہمارے حضور پیش کیا جائے۔

حضرت علیؑ خواہ آسمانِ فضیلت پر ہی کیوں نہ ہوں پھر بھی وہ خدا کے بندے ہیں۔ چنانچہ حضرت علیؑ پیش ہوں گے تو خدا اُن سے پوچھے گا کہ تم نے جو لوگوں کو یہ فتویٰ دیا تھا کہ ہاتھ کھول کر نماز پڑھو کیا تم نے میرے حبیب کی نماز دیکھی تھی؟

حضرت علیؑ عرض کریں گے: جی ہاں، خدایا! میں نے تیرے حبیبؐ کی ہر نماز دیکھی تھی۔ میں نے مکہ کی نمازیں دیکھی تھیں۔ شعب ابی طالب کی نمازیں دیکھی تھیں اور میں نے شب معراج کی نماز دیکھی اور ہجرت کی رات کی نماز دیکھی۔ گھر کے نوافل دیکھے، مدینہ کی تمام نمازیں دیکھی تھیں۔

خدا فرمائے گا کہ بے شک تم سچے ہو، لیکن اپنی صداقت کے لیے دو گواہ پیش کرو۔

اس وقت حضرت علیؑ اپنے فرزندوں کو آواز دے کر کہیں گے: حسنؑ بیٹا!

ادھر آؤ، حسینؑ بیٹا! تم بھی میرے پاس آؤ اور نمازِ رسولؐ کے مشاہدہ کے لیے میری صداقت کی گواہی دو۔

دونوں شاہزادے آگے بڑھ کر عرض کریں گے: خدایا! ہمارے والد سچے ہیں ہم نے بھی اپنے نانا کی نماز اس شان سے دیکھی تھی کہ نانا نماز میں ہوتے تھے اور ہم پشت پر سوار ہوتے تھے۔

الغرض اہلِ بیتؑ کی گواہی مشاہدہ پر مبنی ہے، جب کہ فقہ کے دوسرے ائمہ کی گواہی قیاس واستحسان پر مبنی ہے۔

اہلِ بیتؑ کی طرف یقین ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بول سکتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آیتِ تطہیر میں یہ فیصلہ کردیا ہے کہ ہر طرح کی ناپاکی اور ہر طرح کا رجس اہلِ بیتؑ سے دُور ہے، لہٰذا اہلِ بیتؑ کی گواہی کی صداقت پر یقین ہے جب کہ دوسری طرف شک ہے اور نبی اکرم کا فرمان ہے:

دع ما یریبك الی مالا یریبك

"شک کو چھوڑ کر یقین کی پیروی کرو"۔

لہٰذا ہم اپنے برادرانِ اسلام سے ہمدردانہ گزارش کرتے ہیں کہ خدارا وہ ہر طرح کے مذہبی جذبات سے بلند ہو کر حقیقت کے متلاشی بن کر فیصلہ کریں کہ آیا نماز میں ہاتھ باندھنے کا کوئی شرعی جواز بھی ہے یا نہیں ہے؟

اگر انھیں ہماری اس تحقیق کے بعد بھی کوئی جواز دکھائی دے جائے تو بے شک سابقہ عمل پر قائم رہیں ورنہ اپنی قبر وحشر کی نجات کے لیے رسولِ مقبولؐ اور اہلِ بیتؑ، صحابہ وتابعین کے طریقہ پر عمل کریں اور ہاتھ کھول کر نماز پڑھیں۔

❋❋❋

باب پنجم

رفع یدین

رفع یدین کا مسئلہ بھی اُمتِ اسلامیہ میں متنازعہ مسئلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ رفع یدین کا مقصد ہے کہ تکبیر یعنی اللہ اکبر کہتے وقت دونوں ہاتھوں کو بلند کیا جائے۔ اسلام سے وابستہ تمام مکاتب فکر تکبیر تحریمہ کے وقت دونوں ہاتھ بلند کر کے اللہ کی عظمت و کبریائی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

رفع یدین کے متعلق اسلامی کتب میں اتنی زیادہ روایات موجود ہیں کہ اگر تمام روایات کو جمع کیا جائے تو وہ ایک ضخیم کتاب بن جائے گی۔ اس باب میں ہم سب سے پہلے برادران اہلِ سنت کی مستند کتابوں سے رفع یدین کا ثبوت پیش کریں گے اور سب سے پہلے احادیث کی روشنی میں سنتِ رسول کا جائزہ لیں گے، اس کے بعد صحابہ کرام اور اہلِ بیتؑ طاہرین اور تابعین کے عمل کا جائزہ لیں گے اور بحث کے آخر میں ان روایات کا علمی جائزہ لیں گے، جن میں رفع یدین کا انکار پایا جاتا ہے۔

اب ہم بطور نمونہ چند ایسی احادیث پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں جن میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت حبیب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی پوری حیاتِ مبارکہ میں رفع یدین کیا کرتے تھے:

① حدثنا ایوب بن محمد حدثنا الهاشمی حدثنا عمر عن عبدالله طاؤس عن ابیه عن ابن عباس رضی الله عنه ان رسول الله کان یرفع یدیه عند کل تکبیرة

"(بحذف اسناد) حضرت طاؤس راوی ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں: رسولؐ خدا کا معمول تھا کہ آپؐ ہر تکبیر کے ساتھ رفع یدین کیا کرتے تھے"۔ (سنن ابن ماجہ، جلد اول/ ۲۷۳۔ ابواب اقامة الصلوات والسنة فيها باب ۲۳۸، حدیث ۹۱۱)

② عن عبيد الله بن ابی رافع عن علی بن ابی طالب كرم الله وجهه قال كان النبی صلی الله عليه وآله وسلم اذا قام الی الصلاة المكتوبة كبّر ورفع يديه حتٰی يكونا حذو منكبيه واذا اراد ان يركع فعل مثل ذٰلك واذا رفع رأسه من الركوع فعل مثل ذٰلك واذا قام من السجدتين فعل مثل ذٰلك

"حضرت علی کرم اللہ وجہٗ فرماتے ہیں: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو آپؐ تکبیر کہتے اور آپؐ کندھوں تک ہاتھ بلند کرتے۔ آپؐ رکوع میں جاتے وقت ایسا ہی کرتے اور رکوع سے اُٹھتے وقت اور جب دونوں سجدوں سے اُٹھتے تب بھی آپ ایسا ہی کرتے تھے"۔ (سنن ابن ماجہ، جلد اول/۲۷۳، حدیث ۹۱۰، طبع لاہور۔ مسند احمد بن حنبل، جلد۳/۱۶۵، طبع مصر۔ صحیح ابن خزیمہ، جلد اول/۳۱۳۔ نصب الرایہ، جلد اول/۳۱۲)

③ حدثنا هشام بن عمار حدثنا وفدة بن فضاعة

الغسانی حدثنا الاوزاعی عن عبداللّٰہ بن عبید بن عمیر عن ابیه عن جده بن حبیب قال کان رسول اللّٰہ یرفع یدیه مع کل تکبیرۃ فی الصلاۃ المکتوبة

”(بحذف اسناد) عمیر بن حبیب راوی ہیں کہ رسول اکرمؐ اپنی فرض نمازوں میں ہر تکبیر کے ساتھ ہاتھ بلند کرتے تھے“۔

(سنن ابن ماجہ، جلد اول/۲۷۲۔ ابواب اقامة الصلوات والسنة فیها باب ۲۳۸، حدیث ۹۰۷)

③ اخبرنا محمد بن المثنٰی قال حدثنا ابن ابی عدی عن شعبة عن قتادۃ عن نصر بن عاصم عن مالك الحویرث انه رای النبی رفع یدیه فی صلاۃ واذا رکع واذا رفع رأسه من الرکوع واذ اسجد واذا رفع یدیه فی صلاۃ واذا رکع واذا رفع رأسه من الرکوع واذ اسجد واذا رفع رأسه من السجود حتٰی یحاذی بهما فروع اذنیه

”(بحذف اسناد) حضرت مالک بن حویرث فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرمؐ کو نماز کے آغاز، رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے سر اُٹھاتے وقت اور سجدہ میں جاتے وقت اور سجدہ سے سر اُٹھاتے وقت دونوں ہاتھوں کو بلند کرتے تھے، یہاں تک کہ آپ اپنے ہاتھوں کو کانوں کی لو تک لے جاتے تھے“۔

(سنن نسائی، جلد اول/۳۵۲۔ کتاب الافتتاح، باب رفع الیدین

للسجود، حدیث ۱۰۸۹ تا ۱۰۹۱۔ یہ تینوں احادیث نسائی شریف کی زینت ہیں)

⑤ بیہقی نے سنن بیہقی میں حضرت ابوبکر سے، دارقطنی نے سنن کبیر میں حضرت عمر بن الخطاب سے اور تعلیق المغنی میں حضرت عثمان سے مروی احادیث میں مذکور ہے کہ ان تمام حضرات نے رسول اکرمؐ کے ساتھ نماز پڑھی اور آپؐ ہمیشہ نماز میں رفع یدین کیا کرتے تھے۔ (سنن بیہقی، جلد۲/۳/۷۔ سنن کبیر، جلد اول/۵/۱۷۔ التعلیق المغنی، ص ۱۱۱)

⑥ حضرت انس بن مالک نے فرمایا: حضور اکرمؐ نے اپنی پوری زندگی میں ایسی کوئی نماز نہیں پڑھی جس میں آپؐ نے رفع یدین نہ کیا ہو۔ (مجمع الزوائد، ص ۱۸۲۔ التعلیق المغنی، ص ۱۱۰)

⑦ حضرت براء بن عازب فرماتے ہیں: میں نے اپنی آنکھوں سے رسول اکرم کو رفع یدین کرتے ہوئے دیکھا اور یہ عمل ساری زندگی جاری رہا۔ (سنن بیہقی، جلد۲/۷۷۔ امام حاکم نے اس حدیث کو مستدرک علی الصحیحین میں بھی نقل کیا ہے)

ائمہ حدیث اور رفع یدین

علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب الازہار المتناثرۃ فی الاخبار المتواترۃ میں لکھا ہے کہ رفع یدین کی احادیث متواترہ ہیں۔

امام بخاری نے رفع یدین پر مستقل رسالہ تالیف کیا تھا جس میں انھوں نے لکھا کہ ہم نے آج تک حجاز و عراق کے جتنے بھی علماء کو پایا ہے ان میں سے کسی

کے نزدیک اتنی ثابت نہیں جتنا کہ رفع یدین کی احادیث ثابت ہیں۔ (امام بخاری کی جزء رفع یدین، ص ۱۶)

آنحضرتؐ کے بعد اہل بیت طاہرین علیہم السلام اور صحابہ کرام ہمیشہ رفع یدین پر عمل کرتے رہے۔

حضرت علیؑ کا طرزِ عمل

عن عمران بن حصین قال صلی مع علی بالبصرۃ فقال ذکرنا ھذا الرجل صلاۃ کنا نصلیھا مع رسول اللہ فذکر انہ یکبر کلما رفع وکلما وضع

''عمران بن حصین کہتے ہیں کہ میں نے بصرہ میں حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ نماز پڑھی۔ عمران کہتے ہیں کہ اس مرد نے ہمیں وہ نماز یاد دلا دی جو ہم رسولؐ اللہ کے ساتھ پڑھتے تھے۔ پھر عمران نے کہا کہ وہ جب سجدہ سے اُٹھتے تو تکبیر کہتے اور جب سجدہ میں جھکتے تو تکبیر کہتے تھے''۔

امام سجادؑ کی بیان کردہ روایت

عن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب انہ قال کان رسول اللہ یکبر فی الصلاۃ کلما خفض ورفع فلم تزل تلک صلاتہ حتی لقی اللہ

''حضرت امام زین العابدین فرماتے ہیں: رسولؐ اللہ جب بھی نماز میں جھکتے اور اُٹھتے تو تکبیر کہا کرتے اور وفات تک آپؐ

کی زندگی کا یہی معمول رہا تھا"۔ (موطا امام مالک، باب ۱۴، افتتاح الصلاۃ، ص ۹۰)

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کا طرزِ عمل

زرارہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے ساتھ نماز پڑھی۔ آپؑ نے ہر تکبیر پر رفع یدین کیا۔ (مذہب شیعہ کی مستند کتاب، فروع کافی، جلد۲/۶۶)

صحابہ کرام کا طرزِ عمل

حضرت وائل کہتے ہیں کہ میں نے صحابہ کو دیکھا کہ وہ (نماز میں سردی کی وجہ سے) بھاری کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ وہ نماز میں ہاتھوں کو کپڑوں کے اندر اُٹھاتے تھے۔ (صلاۃ المسلمین از بانی جماعت المسلمین مسعود احمد، ص ۳۵۴-۳۵۵، بحوالہ ابوداؤد و روی نحوہ البخاری فی جزء رفع الیدین، ص ۱۳)

موصوف لکھتے ہیں کہ رفع یدین کی حدیث روایت کرنے والے صحابہ کی تعداد ۵۰ ہزار تک پہنچتی ہے، لیکن یہ رفع یدین کرنے والوں کی تعداد نہیں ہے۔ رفع یدین تو بلا استثناء سب ہی صحابہ کرتے تھے۔ (صلاۃ المسلمین، ص ۳۵۴)

حضرت حمید بن ہلال کہتے ہیں:

کان اصحاب النبی اذا صلوا کان ایدیھم حیال اذانھم کانھا المراوح

"رسولؐ خدا کے اصحاب جب نماز پڑھتے تھے تو ان کے ہاتھ کانوں کے برابر یوں لگتے تھے گویا کہ وہ پنکھے ہیں"۔ (صلاۃ

المسلمین، ص ۴۵۶ بحوالہ جزء رفع الیدین، امام بخاری، ص
۱۳۔ سندہ حسن اس کی سند حسن ہے)

علامہ محمد صادق سیالکوٹی نے اپنی کتاب ''صلاۃ الرسول'' ص ۲۳۵ پر عنوان دیا ہے: ''رفع یدین کے متعلق چار سو روایتیں ہیں''۔

پھر انھوں نے لکھا ہے: علامہ مجدالدین فیروز آبادی مصنف قاموس سفر السعادت میں لکھتے ہیں:

کثرت این معنٰی بہ تواتر ماندہ است وچہار صد اثر وجز دریں باب صحیح شدہ وعشرہ مبشرہ روایت کردہ اند لا یزالی بریں کیفیت بود تا ازیں جہان رحلت کردہ غیر ازیں چیزے ثابت شدہ

''رفع یدین کی روایات اتنی زیادہ ہیں کہ وہ متواتر حدیث کے مشابہ ہیں۔ اس مسئلہ میں ۴۰۰ احادیث اور آثار آئے ہیں۔ عشرہ مبشرہ نے ان کو روایت کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس طرح نماز پڑھتے رہے، یہاں تک کہ اس دنیا سے رحلت فرما گئے۔ اس کے علاوہ اور کچھ ثابت نہیں''۔

پھر اسی کتاب میں علامہ موصوف لکھتے ہیں: ہر مسلمان رفع یدین کے ساتھ نماز پڑھے، اس کے بغیر نماز کا یقیناً نقصان ہے۔

جناب محمد اکرم ججہ صاحب نے رفع یدین کے عنوان پر پوری کتاب لکھی ہے اور اس کے صفحہ ۲۶-۲۷ پر لکھا ہے: ''عشرہ مبشرہ اور دیگر اکابر صحابہ رفع یدین کی سنت روایت کرنے پر متفق ہیں۔ (بحوالہ بیہقی و نیل الاوطار، جلد ۲، ص ۱۸۳۔ تحفۃ

الاحوذی، ص ۲۱۹)

رفع یدین از نظر علمائے اہلِ تسنن

حافظ عبدالمنان نور پوری کی کتاب أحکام و مسائل (طبع مکتبۃ الکریم، جلداول/۱۸۲) کی عبارت ملاحظہ فرمائیں:

سوال: کیا نماز میں رفع الیدین فرض ہے یا سنت ہے؟

جواب: فرض یا سنت کی وضاحت کسی حدیث میں نہیں آئی۔ البتہ احادیث سے یہ چیز ضرور ثابت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز میں رفع یدین کرتے تھے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں:

والذی یرفع احب الی ممن لا یرفع فان احادیث الرفع اکثر واثبت

"رفع یدین کرنے والا مجھ کو رفع یدین نہ کرنے والے سے زیادہ محبوب ہے، کیونکہ رفع یدین کرنے والی احادیث کثرت سے ہے اور انتہائی مستحکم ہیں"۔ (حجۃ اللہ البالغۃ، جلد۲/۱۰، ترجمہ اُردو علامہ محمد منظور الوحیدی، جلد۲/۴۸۵)

کتاب صلاۃ المسلمین، ص ۳۵۴ پر التحقیق الراسخ فی ان احادیث رفع الیدین لیس لها ناسخ کے حوالے سے یہ الفاظ مرقوم ہے:

وحدیث رفع الیدین فی الصلاۃ فقد رواہ خمسون من الصحابۃ

"رفع یدین کی روایات کو پچاس صحابیوں نے نقل کیا ہے"۔

علامہ سیوطی الازہار المتناثرہ فی الاخبار المتواترہ میں لکھتے ہیں کہ رفع یدین کی حدیث متواتر ہے۔

وہ احادیث جن سے رفع یدین کی نفی ہوتی ہے اور ان احادیث کی کیفیت

ذیل میں ہم ایسی روایات نقل کرتے ہیں جن سے رفع یدین کی نفی ہوتی ہے اور ہر روایت کے ساتھ ساتھ ہم اس کی علمی کیفیت اور اس کے ضعف کو ثابت کریں گے، تاکہ رفع یدین کے منکرین کے پاس کوئی عذر یا بہانہ نہ رہے اور اگر اس کے باوجود بھی کوئی شخص اپنی ضد پر قائم رہے تو وہ جانے اور اس کا خدا جانے۔

① ابن مسعود کہتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے ساتھ نماز پڑھی۔ ان سب نے تکبیر تحریمہ کے علاوہ اور کہیں رفع یدین نہیں کیا تھا۔ (رواہ دارقطنی والبیہقی)

اس کا جواب امام البانی نے اپنی کتاب فقہ الحدیث (جلداول/۴۰۲) میں یوں تحریر کیا ہے:

ا: امام ابن جوزی نے اس روایت کو موضوع یعنی خودساختہ قرار دیا ہے جب کہ دارقطنی نے روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے۔ یہ محمد بن جابر نے حماد سے روایت کی ہے، جب کہ وہ ضعیف ہے۔

ب: امام ترمذی ابن مسعود کی اس روایت کے متعلق لکھتے ہیں کہ ابن مسعود کی یہ حدیث ثابت نہیں ہے۔ (جامع ترمذی، جلد اول، باب ۸۷، حدیث ۲۴۲)

② براء بن عازب سے مروی ہے کہ رسولؐ اللہ جب نماز شروع کرتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے کانوں تک اُٹھاتے تھے۔ ثم لا یعود "پھر دوبارہ رفع یدین نہیں کرتے تھے"۔ (ابوداؤد، باب ۲۶۸، حدیث ۷۴۵)

اس کے جواب میں امام البانی نے اس حدیث اور اس سے ملتی جلتی احادیث کو یکجا لکھا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ اور اس جیسی تمام احادیث ضعیف ہیں۔ (فقہ الحدیث، جلد اول/۴۰۳)

ب: اس روایت کے ایک راوی کا نام یزید بن ابی زیاد ہے۔ اس سے یہ روایت بھی ہے کہ رسولؐ خدا نماز کی ابتداء میں اور رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد رفع یدین کیا کرتے تھے۔ (صلاۃ المسلمین، ص ۳۲۵، بحوالہ بیہقی، جلد۲/۷۷۔ جب یزید بوڑھے ہوئے تو ان کا حافظہ خراب ہوگیا تھا۔ کوفہ والوں نے انھیں ثم لا یعود سکھا دیا اور وہ حافظہ کی خرابی کی وجہ سے یہ لفظ کہنے لگ گئے تھے)

امام شوکانی ''نیل الاوطار'' میں لکھتے ہیں: ایک مرتبہ اُنھوں نے علی بن عاصم کے سامنے یہ حدیث پڑھی تو اس میں ثم لا یعود کے الفاظ نہیں کہے۔

علی بن عاصم نے اس سے کہا کہ آپ نے تو ثم لا یعود بھی تو کہا ہے۔ کہنے لگے: مجھے یاد نہیں ہے۔ (بحوالہ دار قطنی، صلاۃ المسلمین/۳۲۵-۳۲۶)

ج: کتاب نبوی نماز کے مؤلف نے براء بن عازب کی اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: امام نووی فرماتے ہیں: یہ حدیث ضعیف ہے اور اسے سفیان بن عینیہ، امام شافعی، امام بخاری کے استاد امام حمیدی اور امام احمد بن حنبل جیسے ائمہ حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے۔

③ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ رفع یدین کا عمل ایک آدھ مرتبہ ہوا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ منافقین اپنی آستینوں اور بغلوں میں بت رکھ کر لاتے تھے۔ چنانچہ بتوں کو گرانے کے لیے رفع یدین کیا گیا تھا، لیکن یہ ایک افسانہ ہے۔ کتبِ حدیث میں اس کا کہیں نام ونشان دکھائی نہیں دیتا۔ اور یہ بات جاہلوں کی ساختہ پرداختہ

ہے۔ کسی صحیح حدیث واثر تو رہی دُور کی بات یہ بات کسی ضعیف اور من گھڑت روایت میں بھی ثابت نہیں ہے۔

④ ابن زبیر سے روایت ہے کہ رسولؐ خدا نے رفع یدین کیا تھا، لیکن آپؐ نے بعد میں اُسے چھوڑ دیا۔ اس کا جواب نمازِ نبویؐ کے مؤلف نے ص ۱۶۹ پر یہ لکھا ہے کہ یہ حدیث مُرسَل ہے۔ اور مُرسَل روایت جمہور محدثین کے ہاں حجت نہیں ہے۔ (بحوالہ محدث گوندلوی، التحقیق الراسخ، ص ۱۲۳)

⑤ عن سالم عن ابیه قال رأیت رسول اللّٰه اذ استفتح الصلاة رفع یدیه حتی یحاذی منکبیه هو اذا اراد ان یرکع وبعد ما یرفع رأسه من الرکوع ولا یرفع بین السجدتین (ابوداؤد، کتاب الصلاۃ، پارہ ۵، باب ۲۶۴، حدیث ۱۶۷۔ تطہیر الشام، ص ۴۸)

"سالم نے اپنے باپ سے روایت کی ہے کہ میں نے رسولؐ خدا کو دیکھا کہ آپؐ نیت نماز کے وقت تکبیر تحریمہ کہتے تھے اور اپنے ہاتھوں کو کندھوں تک لے جاتے تھے اور جب رکوع میں جاتے اور رکوع سے سر اُٹھاتے اور دونوں سجدوں کے درمیان رفع یدین نہیں کرتے تھے"۔

(: یہ روایت بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ صحیح الاسناد حدیث میں یہ الفاظ موجود ہیں:

عن ابن عمر انه کان یرفع یدیه اذا دخل الصلاة واذا رکع واذا قال سمع اللّٰه لمن حمده واذا سجد...... المحلّٰی (امام ابن حزم، جلد ۳، حدیث ۶۷۵)

"امام حزم لکھتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح السند ہے۔ ابن عمر بیان
کرتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نماز کی ابتداء میں اور رکوع کے وقت۔
اور سمع اللہ لمن حمدہ کہنے کے وقت اور سجدہ کرتے وقت
رفع یدین کرتے تھے"۔

یہی وجہ ہے کہ خود ابن عمر پوری نماز میں ہر تکبیر کے وقت رفع یدین کرتے تھے۔

ب: اس سے قبل ہم ہاتھ کھولنے کے باب میں ابوحمید ساعدی کی روایت نقل کر چکے ہیں کہ اُنھوں نے دس صحابیوں کی موجودگی میں کہا کہ میں نمازِ رسول کو تم سب سے زیادہ جانتا ہوں۔

وہاں پر موجود صحابہ نے کہا کہ آپ کا عرصہ صحبت ہم سے زیادہ نہیں ہے اور آپ نے ہم سے زیادہ پیغمبرؐ کی اتباع بھی نہیں کی ہے۔ اگر اس کے باوجود تم یہ دعویٰ کرتے ہو تو بتاؤ رسول اکرمؐ کیسے نماز پڑھتے تھے؟

اس پر ابوحمید ساعدی نے دس صحابہ کے سامنے نمازِ رسولؐ کو بیان کیا جس میں اُنھوں نے آنحضرتؐ کی ہر تکبیر پر رفع یدین کا ذکر کیا اور جب وہ پوری نماز کی کیفیت بیان کر چکے تو محفل میں موجود تمام صحابی نے ان کی تصدیق کی اور کہا کہ بے شک تم نے سچ کہا ہے: رسولؐ خدا واقعی ایسے ہی نماز پڑھتے تھے۔

چونکہ ابوحمید ساعدی کی روایت کی تصدیق دس صحابہ نے کی تھی اسی لیے یہ ایک حدیث گیارہ الگ الگ احادیث کے برابر ہے۔ لہٰذا اس ایک حدیث کے بیان کے مطابق رفع یدین کے عمل کی گیارہ صحابہ نے مل کر تائید و تصدیق کی ہے۔ اس لیے اس عمل کو صحابہ کی طرف سے تصدیق شدہ عمل کا درجہ حاصل ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں: سنن ابوداؤد، کتاب الصلاۃ، حدیث ۷۳۶)

باب ششم

قنوت

مکتبِ امامت اور مکتبِ خلافت کے پیروکاروں کی نماز کے طریقہ میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں ان میں سے ایک اختلاف دعائے قنوت کا بھی ہے۔ مکتبِ اہلِ بیتؑ کے پیروکار اپنی تمام نمازوں خواہ وہ نافلہ ہوں یا فریضہ، ان میں دوسری رکعت میں رکوع سے پہلے دعائے قنوت پڑھتے ہیں اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ دوسری رکعت کی دوسری سورہ مکمل کرنے کے بعد اللہ اکبر کہہ کر دونوں ہاتھ دعا کے لیے اُٹھاتے ہیں اور اس میں محمدؐ و آلِ محمدؐ پر درود پڑھتے ہیں اور اس کے بعد قرآن کریم میں موجود کوئی سی دعا پڑھتے ہیں: مثلاً: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ـــــ یا رَبَّنَا اغْفِرْلِیْ وَ لِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ پڑھ کر آخر میں پھر محمدؐ و آلِ محمدؐ پر درود پڑھتے ہیں، جب کہ دوسرے اسلامی فرقے اس کا التزام نہیں کرتے۔ جب کہ امام ابوحنیفہ کے ہاں وتر کی تیسری رکعت میں قرأت کے بعد رکوع سے پہلے قنوت کا پڑھنا واجب ہے۔ (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ، جلد اول/۳۸۰-۵۲۳)

امام احمد بن حنبل کے مطابق وتر میں قنوت پڑھنا سنت ہے۔ (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربع، جلد اول/۳۹۳)

امام شافعی کے نزدیک بلند آواز سے دعائے قنوت پڑھنا سنت ہے، مگر ماہِ

رمضان میں وتر کی تیسری رکعت میں اور نماز فجر میں مسنون ہے، لیکن دوسری رکعت کے رکوع کے بعد اور دعائے قنوت کے بعد رسول اللہؐ اور ان کی آل اولاد پر درود کو سنت "ابعاض" کہتے ہیں۔ (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربع، جلد اول (ص ۳۸۶۔ تفسیر ابن کثیر، جلد اول/۱۱۵)

قنوت کی اہمیت کے لیے مندرجہ ذیل روایات ملاحظہ فرمائیں:

علامہ سیوطی نے تفسیر درمنثور (جلد اول) وقوموا للہ قانتین کی آیت کے ضمن میں یہ احادیث نقل کی ہیں:

① اخرج البخاری والبیهقی من طریق ابی قلابة عن انس قال کان القنوت فی الفجر والمغرب

"امام بخاری وبیہقی نے ابوقلابہ کے طریق سے انس بن مالک سے روایت کی ہے کہ نماز فجر اور مغرب میں قنوت پڑھی جاتی تھی"۔

② اخرج الطبرانی فی الاوسط والدارقطنی والبیهقی عن البراء بن عازب ان رسول اللّٰه کان یقنت فی الصبح والمغرب

"طبرانی نے اوسط میں اور دار قطنی اور بیہقی نے براء بن عازب سے روایت کی ہے کہ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فجر اور مغرب کی نماز میں قنوت پڑھا کرتے تھے"۔

③ ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ میں نے ایک روز ابوہریرہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں تمھارے سامنے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سی نماز پڑھتا ہوں۔

ابوسلمہ کا بیان ہے کہ ابوہریرہ ظہر، عشا اور صبح کی نمازوں میں قنوت پڑھتے تھے اور اس میں مسلمانوں کے لیے دعا اور کافروں پر لعنت کیا کرتے تھے۔ صحیح مسلم (اردو) جلد اول، باب ۲۳۱-۲/۱۵۹۔ امام نووی فی شرح صحیح مسلم، جلد اول/۲۳۷۔ علاوہ ازیں ابن تیمیہ نے اس حدیث کو منتقی الاخبار جلد اول حدیث ۱۱۲۵ کے تحت نقل کیا ہے۔

مزید حوالوں کے لیے حدیقۃ الاظہار علامہ محمد داؤد راغب، جلد اول/۳۶۹۔ محلی ابن حزم، ترجمہ حریری، جلد ۳/۱۸۹۔ فقہ الحدیث امام ناصرالدین البانی ترتیب وتالیف حافظ عمران ایوب جلد اول، کتاب الصلاۃ، ص ۴۴۲ بحوالہ بخاری۔ مسند احمد جلد ۲/۲۳۷۔ ابوداؤد حدیث ۱۴۴۰، نسائی جلد ۲/۲۰۲۔ دارقطنی، ۲/۳۸۔ بیہقی جلد ۲/۱۹۸۔

> عن البراء بن عازب ان النبی (ص) کان یقنت فی صلاۃ الصبح والمغرب ...... قال ابوعیسٰی حدیث البراء حسن صحیح
>
> "براء بن عازب راوی ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صبح اور مغرب کی نمازوں میں قنوت پڑھا کرتے تھے۔ امام ترمذی لکھتے ہیں کہ حدیث براء حسن صحیح ہے"۔

۴۔ تعلیقات سلفیہ فتاویٰ شیخ حسین (ص ۱۵۸) کے حوالے سے محمد قاسم صاحب اپنی کتاب حی علی الصلاۃ، ص ۵۳ پر لکھتے ہیں کہ دعائے قنوت کے وقت دعا کرنے والے کی طرح ہاتھ اُٹھانا سنت ہے۔ چنانچہ ابن مسعود، ابن عمر، انس اور ابوہریرہ سے ایسا ہی مروی ہے۔

جماعۃ المسلمین کے بانی مسعود احمد نے اپنی کتاب صلاۃ المسلمین کے ص ۳۰۳ پر لکھا ہے:

کان القنوت فی المغرب والفجر

"مغرب اور فجر کی نمازوں میں قنوت پڑھی جاتی تھی"۔

تمام نمازوں میں قنوت کا پڑھا جانا

محقق سید غلام رضا شاہ نقشی نے اپنی کتاب صلاۃ المتقین میں لکھا ہے کہ قنوت کو صرف چند نمازوں سے مخصوص کرنا صحیح نہیں ہے، بلکہ تمام نمازوں میں قنوت پڑھی جاتی تھی جس کے حوالہ جات حسب ذیل ہیں:

① حضرت براء بن عازب نے روایت کی ہے کہ رسولؐ خدا اپنی ہر نماز میں قنوت پڑھتے تھے۔ (ملاحظہ فرمائیں: المحلی ابن حزم، جلد۳، حدیث ۴۴۷، ص ۱۹۰ (اُردو) بحوالہ امام بیہقی، جلد۲/ ۱۹۸، دار قطنی، جلد۲/ ۳۸-۲۵۳)

امام ابن حزم اندلسی نے اس حدیث اور قنوت کے متعلق وارد ہونے والی تمام احادیث کے متعلق لکھا ہے کہ یہ سب روایات وہ نص ہیں جس پر ہم نے اپنے قول کی بنیاد رکھی ہے۔ (المحلی، جلد۳/۱۹۱)

اہلِ سنت کے مشہور امام الحدیث نے براء بن عازب کی روایت کو نص مان لیا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ اپنی تمام نمازوں میں قنوت کا التزام کیا کرتے تھے۔

② اخرج ابن ابی شیبة و مسلم والترمذی و ابن ماجه عن جابر قال قال رسول اللّٰه (ص): "افضل

الصلاۃ طول القنوت"

"امام ابن ابی شیبہ، امام مسلم، امام ترمذی، امام ابن ماجہ نے جابر سے روایت کی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "افضل نماز وہ ہے جس میں قنوت لمبا ہو"۔ (ملاحظہ فرمائیں: اشعۃ اللمعات، جلد۲، حدیث ۷۴۴۔ تفسیر درمنثور امام سیوطی، جلد اول، درضمن، آیت وقوموا للہ قانتین، ص۷۳۲-۷۳۳)

۳ اخرج الطبرانی فی الاوسط والدارقطنی والبیهقی عن البراء بن عازب قال کان رسول اللہ لا یصلی الصلاۃ المکتوبۃ الا قنت فیها

"طبرانی، دارقطنی اور بیہقی نے براء بن عازب سے روایت کی ہے کہ حضرت رسول اکرمؐ جب بھی نماز فریضہ پڑھتے تو اس میں قنوت ضرور پڑھا کرتے تھے"۔ (تفسیر درمنثور)

۴ قوله علیه السلام لما سئل ای الصلاۃ افضل؟ قال طول القنوت

"رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کون سی نماز افضل ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ جس میں قنوت لمبا ہو"۔ (تفسیر کبیر امام فخر الدین رازی، جلد۳، المسألۃ الاولی، القنوت زیر تفسیر آیت وقوموا للہ قانتین، ص۱۵۳)

جماعۃ المسلمین کے بانی نے اپنی کتاب "صلاۃ المسلمین" (ص۳۰۴) کے

حاشیہ پر لکھا ہے:

صحيح مسلم باب استحباب القنوت في جميع الصلاة
کہ دعائے قنوت تمام نمازوں میں مستحب ہے اور یہی باب امام نووی کی شرح مسلم میں ہے اور اس باب کو امام مسلم نے قائم کیا ہے"۔

قنوت رکوع سے پہلے یا بعد میں؟

① عن عاصم قال سئلت انس عن القنوت قبل الركوع او بعد الركوع؟ قال قبل الركوع......
"عاصم بیان کرتے ہیں کہ میں نے انس سے پوچھا کہ قنوت رکوع سے پہلے ہے یا بعد میں؟ اُس نے جواب دیا کہ رکوع سے پہلے ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں مشکوٰۃ شریف، مترجم عابد الرحمٰن کاندھلوی، جلد ۳، حدیث ۱۲۱۶، ص ۲۹۱)

② اسی روایت کو صحیح مسلم کے حوالے سے جماعۃ المسلمین کے بانی نے اپنی کتاب صلاۃ المسلمین کے ص ۳۰۹ پر بھی نقل کیا ہے۔

③ حدثنا مسدد قال حدثنا عبدالواحد قال حدثنا عاصم قال سألت انس بن مالك عن القنوت فقال قد كان القنوت قبل الركوع او بعده قال قبله ، قال فان فلانا اخبرني عنك انك قلت بعد الركوع فقال كذب (صحیح بخاری، جلد اول/۳۴۷)

"عاصم بیان کرتے ہیں کہ میں نے انس بن مالک سے سوال کیا کہ قنوت کے متعلق تو اس نے کہا: جی ہاں قنوت پڑھی جاتی تھی۔ میں نے پوچھا کہ قنوت رکوع سے پہلے پڑھی جاتی تھی یا بعد میں؟ اُنھوں نے کہا کہ رکوع سے پہلے پڑھی جاتی تھی۔ میں نے کہا: فلاں شخص نے آپ کے متعلق کہا ہے کہ آپ نے یہ بیان کیا ہے کہ قنوت رکوع کے بعد پڑھنی چاہیے؟! حضرت انس نے فرمایا: اس نے جھوٹ کہا ہے؟"

اس کے بعد حضرت انس نے یہ وضاحت فرمائی:

انما قنت رسول الله بعد الركوع شهرا اراه كان بعث قوما يقال لهم القراء زهاء سبعين رجلا الى قوم من المشركين دون اولئك كان بينهم وبين رسول الله عهدا فقنت رسول الله شهرا يدعو عليهم

"بے شک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رکوع کے بعد صرف ایک مہینہ قنوت پڑھی تھی اور میرا خیال یہ ہے کہ یہ عمل آپ نے اس وقت کیا تھا جب آپ نے ستر قاریوں کو مشرکین کی ایک قوم کے پاس بھیجا تھا۔ آپ کے اور ان کے درمیان معاہدہ تھا، لیکن انھوں نے تمام قاریوں کو شہید کر دیا تھا۔ اس کے بعد رسولِ خدا نے ایک ماہ تک رکوع کے بعد قنوت پڑھی اور مشرکین کی بربادی کے لیے دعا فرمائی"۔ (صحیح بخاری، جلد اول، باب القنوت قبل الرکوع وبعدہ، حدیث ۹۴۵)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حبیبؐ خدا معمول کے مطابق دوسری رکعت میں ہمیشہ رکوع سے پہلے قنوت پڑھتے تھے، البتہ بئر معونہ کے واقعہ کے بعد مشرکین کی تباہی کے لیے ایک ماہ تک رجوع کے بعد قنوت پڑھی تھی۔

صحابہ کرام کا عمل

(۱) طارق قال صليت خلف عمر بن الخطاب صلاة الصبح فما فرغ من القراءة في الركعة الثانيه كبر ثم قنت ثم كبر فركع

"طارق بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن الخطاب کے پیچھے نماز فجر پڑھی۔ انھوں نے دوسری رکعت کی جیسے ہی قرأت مکمل کی تو تکبیر کہی اور قنوت پڑھی۔ پھر تکبیر کہی اور رکوع کیا"۔ (ملاحظہ فرمائیں کنزالعمال، جلد۴/۱۹)

(۲) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نماز میں ہاتھ بلند کر کے رکوع سے پہلے قنوت پڑھا کرتے تھے۔ (تفسیر ابن کثیر، جلد اول، پارہ ۲/۱۱۵)

(۳) اُم المومنین بی بی عائشہ ہر نماز میں ہاتھ اُٹھا کر قنوت پڑھا کرتی تھیں۔ (تاریخ ابوالفداء، ص ۸۳۷، تاریخ کامل ابن اثیر، جلد۳/۱۴۰)

(۴) حضرت ابوحلیمہ و معاذ دعائے قنوت میں آنحضرتؐ اور ان کی آلؑ پر درود پڑھا کرتے تھے۔ (تذکرۃ الحفاظ ذہبی، جلد۳، ص۸۰۳)

ائمہ اہلِ بیتؑ اور قنوت

(۱) کنزالعمال، ابوبکر بن شیبہ کی کتاب "المصنف" اور جمع الجوامع میں

عبدالرحمٰن بن معقل سے روایت ہے کہ حضرت علی بن ابی طالبؑ ہر نماز کی دوسری رکعت میں ہاتھ اُٹھا کر دعائے قنوت پڑھا کرتے تھے۔

۲ ابوبصیر نے امام محمد باقر علیہ السلام سے پوچھا کہ قنوت کون سی نماز میں پڑھنی چاہیے؟ آپؑ نے فرمایا: تمام نمازوں میں۔ (فروع کافی، جلد۲/۱۰۶۔ اُردو ترجمہ مطبوعہ کراچی)

۳ ابن یقطین سے روایت ہے کہ میں نے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے قنوت کے متعلق پوچھا کہ رکوع سے پہلے ہے یا بعد میں؟ آپؑ نے فرمایا: قنوت رکوع سے پہلے ہے۔

قنوت چھوڑنے کی وجہ

قارئین کرام! ہم احادیث سے عرض کر چکے ہیں کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اہلِ بیت طاہرین علیہم السلام اور صحابہ کرام دوسری رکعت میں رکوع سے قبل دعائے قنوت پڑھا کرتے تھے اور اس میں اہلِ ایمان کے لیے دعا مانگتے تھے اور بعض اوقات کفار کے ظلم وستم کی وجہ سے کفار ومشرکین پر بددعا کرتے تھے۔

لیکن زمانہ بدلا، زمانے کے اقدار بدلے۔ وہ دعائے قنوت جس میں رسولؐ خدا، صحابہ اہلِ ایمان کے لیے دعا کرتے تھے۔ دورِ معاویہ میں دین خداوندی کی وہ درگت بنائی گئی کہ معاویہ دعائے قنوت پڑھتا تھا اور وہ اپنی دعائے قنوت میں حضرت علیؑ، امام حسنؑ، امام حسینؑ، عبداللہ بن عباسؓ اور مالک اشترؓ پر لعنت کیا کرتا تھا۔ (تاریخ کامل ابن اثیر، جلد۳/۱۳۳، طبع مصر)

ہمارے کسی بھی محترم قاری کو معاویہ کے اس فعل پر ہرگز تعجب نہیں کرنا

چاہیے، کیونکہ اسے جنگِ بدر میں قتل ہونے والے اپنے بھائی بند نہیں بھولے تھے۔ اسی لیے اس نے کھل کر اسلام اور مسلمانوں سے اس کا بدلہ لیا تھا۔ یہ معاویہ ہی تھا جس نے تمام مساجد کے ائمہ کو سرکاری حکم نامہ کے ذریعے سے اس بات کا پابند کیا تھا کہ وہ خطبہ جمعہ وعیدین میں حضرت علیؑ اور اُن کے خاندان پر سَب وشتم کریں اور اُس نے اپنے مقرر کردہ ائمہ مساجد کو حکم دیا تھا کہ وہ دعائے قنوت میں حضرت علیؑ اور حسنین کریمینؑ اور اُن کے چاہنے والوں پر لعنت وتبرا کریں۔

چنانچہ امام ابن شہاب زہری بیان کرتے ہیں کہ معاویہ کے دور میں لوگوں کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ اپنی نمازوں میں دورانِ قنوت حضرت علیؑ ، اولادِ علیؑ اور اُن کے ساتھیوں پر لعنت کریں۔ (چنانچہ ملاحظہ فرمائیں: امام ابن حمزہ مدنی کی بدعات فی السنۃ، ص ۳۱۵۔ تاریخ ملوکیت فی الاسلام، ص ۶۷۲)

معاویہ نے جس رسمِ بد کا آغاز کیا تھا وہ اس کے مرنے کے بعد بھی سالہا سال تک جاری رہی یہاں تک کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے برسرِ اقتدار آ کر اس مکروہ بدعت پر پابندی عائد کی تھی۔ (طبقات ابن سعد، جلد ۵/۱۷۵۔ تاریخ خمیس، جلد۲/۳۵۴۔ خلافت وملوکیت مودودی)

عمر بن عبدالعزیز نے صرف خطباتِ جمعہ وعیدین میں سَب وشتم کو ہی ممنوع قرار نہیں دیا تھا اس نے یہ بھی حکم دیا تھا کہ آئندہ دعائے قنوت میں حضرت علیؑ اور اُن کے خاندان پر تبرا بازی نہیں کی جائے گی۔ اس پابندی کا یہ نتیجہ نکلا کہ لوگ جو کہ طویل عرصہ سے لعنت وتبرا بازی کے عادی ہو چکے تھے اُنھیں اس کی متبادل دعا نہ ملی تو اُنھوں نے سرے سے قنوت پڑھنا ہی چھوڑ دی۔

***

باب ہفتم

سجدہ میں جانے کے دو طریقے

سجدہ نماز کا ارفع ترین رکن ہے اور یہ بندگی کی انتہا ہے اور یہ قرب الٰہی کا مؤثر ترین وسیلہ ہے اور سجدہ معراج مومن ہے اور علامہ اقبال کے بقول:

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے آدمی کو بخشتا ہے نجات

آیئے خدارا! تحقیق کریں کیا ہمارے سجدہ میں جانے کا انداز وہی ہے جس کی تعلیم حبیبؐ خدا نے دی تھی اور کیا ہم نے سنت رسولؐ کے بجائے کوئی اور طریقہ تو اپنایا ہوا نہیں ہے؟

سجدہ میں جانے کے دو طریقے رائج ہیں:

① سجدہ میں جاتے وقت پہلے گھٹنوں کو زمین پر رکھا جاتا ہے اس کے بعد ہاتھ زمین پر رکھے جاتے ہیں۔

② سجدہ میں جاتے وقت پہلے ہاتھوں کو زمین پر رکھا جاتا ہے، اس کے بعد گھٹنوں کو زمین پر رکھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی تیسرا طریقہ رائج نہیں ہے۔

اب آیئے ان دونوں طریقوں پر تحقیق کریں کہ ان میں سے رسولؐ خدا کا طریقہ کون سا ہے اور ہمارا ایجاد کردہ طریقہ کون سا ہے؟ ہم اپنی تحقیق کا آغاز پہلے طریقے سے کرتے ہیں۔

ائمہ اربعہ

اس سلسلہ میں ائمہ اربعہ کے درمیان اختلاف ہے۔ دو ائمہ یعنی امام ابوحنیفہ، امام احمد بن حنبل اور بعض روایات کے مطابق امام شافعی بھی پہلے طریقے کے قائل ہیں۔ ان ائمہ کا قول ہے کہ پہلے زمین پر گھٹنے رکھے جائیں، پھر دونوں ہاتھ رکھے جائیں۔ جب کہ امام مالک اور زیادہ تر روایات کے مطابق امام شافعی بھی دوسرے طریقے کے قائل ہیں۔ (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ، جلد اول/۲۱۳۔ شرح سنن ابی داؤد، جلد اول/۳۲۷، طبع لاہور)

پہلے طریقہ کا استدلال اور اس کا ضعف

حدثنا الحسن بن علي وحين بن عيسٰى قالا حدثنا يزيد بن هارون أخبرنا شريك عن عاصم بن كليب عن ابيه عن وائل بن حجر قال رأيت النبي اذا سجد وضع ركبتيه قبل يديه واذا نهض رفع يديه قبل ركبتيه

"ہم سے حسن بن علی اور حسین بن عیسٰی نے بیان کیا: انھوں نے کہا کہ ہم سے یزید بن ہارون نے، اس نے شریک سے، اس نے عاصم بن کلیب سے، اس نے اپنے والد سے کلیب بن شہاب سے اور اس نے وائل بن حجر سے روایت کی ہے کہ میں نے رسولؐ خدا کو دیکھا کہ جب آپ سجدہ کرتے تو پہلے دونوں گھٹنے زمین پر رکھتے، اس کے بعد دونوں ہاتھ رکھتے تھے

اور جب آپ کھڑے ہوتے تو گھٹنوں سے پہلے ہاتھ اٹھاتے تھے۔ (سنن ابوداؤد، جلد اول/۳۲۷، باب ۳۹۲، حدیث ۸۲۹۔ جامع ترمذی، جلد اول/۱۶۱۔ ابواب الصلاۃ، باب ۱۹۵، حدیث ۲۳۳، طبع کراچی۔ سنن ابن ماجہ، جلد اول/۲۷۷، حدیث ۹۲۹، طبع لاہور)

ہم جانتے ہیں کہ کسی بھی حدیث سے استدلال کے لیے ضروری ہے کہ حدیث کے راوی صحیح ہوں۔ آیئے دیکھیں کہ اس حدیث کے راوی کون ہیں اور حدیث کے ماہرین کے ہاں ان کا مقام و مرتبہ کیا ہے؟ ہم ذیل میں اس حدیث کے صرف تین رواۃ پر بحث کرتے ہیں جو کہ حسب ذیل ہیں:

① عاصم بن کلیب ② شریک ③ یزید بن ہارون

① عاصم بن کلیب:

اس عمل کا ذکر وائل سے صرف عاصم نے ہی کیا ہے۔ اس کے علاوہ کسی دوسرے محدث نے نہ تو وائل سے اور نہ کسی اور حدیث سے اس عمل کو نقل کیا ہے۔ مقصد یہ ہے عاصم اس روایت میں منفرد ہیں۔

امام بخاری کے استاد امام علی بن مدینی فرماتے ہیں:

لا یحتج به اذا انفرد

"جب عاصم منفرد ہو تو اس کی روایت کو دلیل بنانا درست نہیں ہے"۔ (تہذیب التہذیب حافظ ابن حجر عسقلانی، جلد ۵/۴۹)

اس روایت میں بھی عاصم منفرد ہیں، لہٰذا ان کی بیان کردہ روایت پر انحصار

کرنا اور اسے دلیل بنانا صحیح نہیں ہے۔

اس روایت کو عاصم نے اپنے والد کلیب بن شہاب سے روایت کیا ہے اور جب بھی عاصم اپنے والد سے روایت کر رہا ہو تو محدثین کے ہاں اس کا کیا مقام ہوتا ہے، ملاحظہ فرمائیے:

> **قال ابو عبداللّٰہ الآجری سمعت اباداؤد یقول عاصم بن کلیب عن ابیہ عن جدہ لیس بشئی الناس یغلطون یقولون کلیب عن ابیہ لیس ھو ذاك**
>
> "ابوعبداللّٰہ آجری کہتے ہیں کہ امام داؤد فرماتے تھے کہ عاصم بن کلیب اگر اپنے والد کلیب بن شہاب سے روایت کریں تو اس روایت کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ لوگ ان کو غلط قرار دیتے ہیں کہ اس طرح کی روایت کی کوئی بھی قدر و قیمت نہیں ہے، کیونکہ عاصم ابھی کمسن تھا۔ اس کے والد کی وفات ہوگئی تھی"۔ (ملاحظہ فرمائیں: سوالات الآجری لابی داؤد، جلد۳/۱۶۷، طبع مصر)

۲ شریک:

اس کا پورا نام قاضی شریک بن عبداللّٰہ ہے۔ امام بخاری، امام علی بن مدینی، امام احمد بن حنبل اور امام دارقطنی کہتے ہیں کہ "شریک" ضعیف ہے، وہ کثیر الغلط تھا۔ مقصد یہ ہے کہ حدیث بیان کرنے میں کثرت سے غلطیاں کیا کرتا تھا۔ (میزان الاعتدال، جلد۲/۲۷۰۔ سنن ابی داؤد، جلد اول/۲۹۹-۳۲۸، طبع لاہور)

امام عبداللّٰہ بن مبارک نے ان کے متعلق یہ ریمارکس دیے:

لیس حدیث شریک بشئی

''شریک کی بیان کردہ حدیث کی کوئی بھی حیثیت نہیں ہے''۔

(میزان الاعتدال، جلد۲/۲۷۰، طبع بیروت)

دارقطنی نے اس کے متعلق یہ رائے دی تھی:

لیس شریک بالقوی فیما ینفرد به

''شریک جس حدیث کو بیان کرنے میں منفرد ہو وہ حدیث قول نہیں ہے''۔ (میزان الاعتدال، جلد۲/۲۷۰، طبع بیروت)

جوزجانی نے شریک کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ سے کیا تھا:

سیئی الحافظة مضطرب الحدیث مائل

''اس کا حافظہ خراب تھا اور وہ مضطرب قسم کی احادیث بیان کرنے کی طرف مائل تھا''۔ (میزان الاعتدال، جلد۲/۲۷۰، طبع بیروت)

اس حدیث کا تیسرا راوی یزید بن ہارون ہے۔ آیئے علمائے رجال کی اس کے متعلق رائے کو ملاحظہ فرمائیں:

یہ شخص بہت سی احادیث کا حافظ تھا، لیکن اس میں ایک نقص تھا جس کی نشان دہی کرتے ہوئے امام یحییٰ بن معین نے فرمایا:

''یزید بن ہارون تمیز نہیں کرتے تھے اور انھیں اس کی پرواہ نہ تھی کہ وہ کس سے روایت لے رہے ہیں''۔ (تذکرۃ الحفاظ، جلد اول/۲۷۰)

اس حدیث کے بیان میں عاصم اور شریک دونوں منفرد ہیں اسی لیے امام ترمذی نے اسے ''حدیث غریب'' کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ (جامع ترمذی،

جلد اول/۱۶۱)

سجدہ میں جانے کا دوسرا طریقہ

سجدہ میں جانے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پہلے دونوں ہاتھ زمین پر رکھے جائیں اس کے بعد دونوں گھٹنے زمین پر رکھے جائیں۔ آیئے اس طریقہ کا حدیث رسولؐ سے جائزہ لیتے ہیں کہ یہ کس حد تک صحیح ہے؟

پہلی قولی حدیث

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم اذا سجد احدکم یبرک کما یبرک البعیر ولیضع یدیہ قبل رکبتیہ

"آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: جب تم سجدہ کرو تو اُونٹ کی طرح سے بیٹھو۔ پہلے دونوں ہاتھ ٹیک دو پھر گھٹنوں کو"۔ (مستدرک امام حاکم، جلد۲/۳۵۴)

دوسری قولی حدیث

عن الاعرج عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم یعمد احدکم فی صلاتہ یبرک کما یبرک الجمل

"اعرج نے ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: تمھیں اپنی نماز میں ایسے بیٹھنا چاہیے جیسا کہ اُونٹ بیٹھتا ہے"۔

مقصد یہ ہے پہلے ہاتھ زمین پر رکھے پر گھٹنے زمین پر ٹکائے، کیونکہ اُونٹ پہلے اگلے زانو زمین پر ٹکاتا ہے، پھر پچھلے زانو زمین پر ٹکاتا ہے۔ (سنن ابی داؤد، جلد اول/۳۲۸، باب کیف یضع رکبتیہ قبل یدیہ حدیث ۸۳۲، سنن نسائی، جلد اول/۳۵۲، کتاب الافتتاح، باب ۲۶۰، حدیث ۱۰۹۴، جامع ترمذی، جلد اول، حدیث ۳۳۵)

قارئین کرام! بیٹھنے کا یہ انداز صرف اُونٹ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے۔ تمام حلال جانور ایسے ہی بیٹھتے ہیں، وہ ہمیشہ پہلے اگلے زانو زمین پر ٹکاتے ہیں۔ پھر پچھلے زانو زمین پر ٹکاتے ہیں۔

اگر آپ کسی انسان کے بچے کو گرتا ہوا دیکھیں تو اس کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ اس کے جسم سے قبل اس کے ہاتھ زمین پر ٹکیں۔ اس میں بچے کی شعوری کوشش نہیں ہوتی، بلکہ اس کے ہاتھ فطری طور پر خود بخود زمین کی طرف جھکتے ہیں۔ اسلام دین فطرت ہے اور اس کے تمام احکامات فطرت کے عین مطابق ہیں۔

آنحضرتؐ کا عمل

عبداللہ بن عمر کا بیان ہے کہ رسولؐ خدا جب سجدہ میں جاتے تو آپ گھٹنوں سے پہلے اپنے ہاتھوں کو زمین پر رکھتے تھے۔ (صحیح ابن خزیمہ، جلد اول/۳۱۹)

صحابہ کرام کا عمل

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد صحابہ کا بھی یہی عمل رہا، کیونکہ ہم نے جتنی بھی احادیث پیش کی ہیں، یہ سب صحابہ کرام کی ہی بیان کردہ ہیں۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنی وفات تک اپنے عمل کو مسلسل جاری

رکھا تھا اور صحابہ بھی اس پر عمل پیرا رہے تھے۔

① چنانچہ امام بخاری اپنی صحیح میں لکھتے ہیں:

یھوی بالتکبیر حین یسجد وقال نافع کان ابن عمر یضع یدیہ قبل رکبتیہ

"سجدہ میں جاتے ہوئے تکبیر کہہ کر جھکے۔ نافع بیان کرتے ہیں کہ ابن عمر گھٹنوں سے پہلے اپنے ہاتھوں کو زمین پر رکھتے تھے"۔ (صحیح بخاری، جلد اول/۳۷۵، کتاب الاذان، باب ۵۱۹، فتح الباری، جلد اول/۴۳۹، نیل الاوطار، شوکانی جلد۲/۱۴۷)

① حضرت ابوبکر کہتے ہیں کہ حضرت رسولؐ خدا نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی سجدہ کرے تو ہاتھوں سے ابتداء کرے۔ (نیل الاوطار، جلد اول/۲۱۳)

علاوہ ازیں کنزالعمال اور مستدرک حاکم میں حضرت عبداللہ بن عباس اور انس بن مالک کے متعلق مرقوم ہے کہ وہ سجدہ میں جاتے ہوئے پہلے اپنے ہاتھ زمین پر رکھتے تھے پھر اپنے گھٹنوں کو ٹیکا کرتے تھے۔ (کنزالعمال، جلد اول/ ۳۵۵۔ مستدرک حاکم، جلد اول/۳۶۵)

اہلِ بیتؑ کا عمل

حضرت عمران بن حصین نے مسجدِ کوفہ میں حضرت علیؑ کے ساتھ نماز پڑھی۔ جب آپؑ سجدے میں جاتے تو گھٹنوں سے پہلے ہاتھوں کو زمین پر جماتے پھر گھٹنے زمین پر رکھتے اور ابن عباسؓ کا بھی یہی عمل تھا۔ (امام ابن شیبہ کی "المصنف" جلد اول/۲۲۷۔ کنزالعمال، جلد اول/۳۵۶)

یہ نماز عمران بن حصین نے حضرت علی علیہ السلام کے زمانہ خلافت میں ان کے پیچھے پڑھی تھی۔ اس سے یہ بات بخوبی ثابت ہوتی ہے کہ یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ رسولؐ خدا کے زمانے میں یہ طریقہ منسوخ ہو گیا تھا۔

ائمہ اہلِ بیتؑ کے اقوال کے مطابق نمازی جب سجدہ میں جائے تو پہلے دونوں ہاتھ زمین پر رکھے، اس کے بعد اپنے گھٹنے زمین پر لگائے۔ (فروعِ کافی، ثقۃ الاسلام کلینی، جلد دوم/۵۰)

امام مالک اور ائمہ حدیث

امام مالک، امام اوزاعی اور دیگر ائمہ حدیث کی ایک بہت بڑی جماعت اس طریقہ کی قائل ہے کہ پہلے ہاتھوں کو زمین پر رکھے، پھر گھٹنوں کو۔ (سنن ابی داؤد، جلد اول/ ۳۲۷، طبع لاہور)

مندرجہ بالا حوالہ جات سے یہ حقیقت بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ حضرت رسولِ مقبولؐ، اہلِ بیتؑ طاہرین اور صحابہ کرام اور آئمہ حدیث کا یہی عمل تھا کہ وہ پہلے دونوں ہاتھوں کو زمین پر رکھتے تھے، پھر دونوں گھٹنے زمین پر رکھتے تھے، لہٰذا ہم اپنے تمام برادرانِ اسلام سے مؤدبانہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ حقائق کو سمجھیں اور سنتِ رسولؐ پر عمل کریں، کیونکہ خدا کے ہاں وہی نماز مقبول ہوگی جو حبیبؐ خدا کے طریقہ کے مطابق ہوگی اور آقائے نامدار کے طریقہ سے ہٹ کر کی جانے والی عبادت کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی۔

***

باب ہشتم

ذکرِ رکوع و سجود

رکوع اور سجود کے ذکر میں بھی ایک لفظ کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ مکتبِ امامت کے پیروکار رکوع میں سبحان ربی العظیم وبحمدہ پڑھتے ہیں، جب کہ مکتبِ خلافت کے پیروکار صرف سبحان ربی العظیم پڑھتے ہیں۔

اسی طرح سے مذہب اثنا عشریہ سے وابستہ حضرات سجدہ میں سبحان ربی الاعلیٰ وبحمدہ پڑھتے ہیں، جب کہ مذہب اہلِ سنت سے وابستہ حضرات سجدہ میں صرف سبحان ربی الاعلیٰ پڑھتے ہیں۔

چنانچہ ذکر رکوع و سجود میں وبحمدہ کا فرق ہے۔ مکتبِ اہلِ بیتؑ کے پیروکار رکوع و سجود میں تسبیح بھی بجا لاتے ہیں اور حمد بھی بجا لاتے ہیں، جب کہ برادرانِ اہلِ سنت صرف تسبیح بجا لاتے ہیں، حمد نہیں بجا لاتے کیونکہ جب کوئی شخص سبحان ربی العظیم وبحمدہ اور سبحان ربی الاعلیٰ وبحمدہ کہتا ہے تو وہ لفظ "سبحان" سے تسبیح کرتا ہے اور "وبحمدہ" سے حمد بجا لاتا ہے اور جب کوئی بھائی صرف سبحان ربی العظیم یا سبحان ربی الاعلیٰ کہتا ہے تو وہ صرف تسبیح بجا لاتا ہے حمد بجا نہیں لاتا۔

قرآنی آیات

قرآنِ کریم کی اکثر آیات میں اللہ نے تسبیح کو حمد کے ساتھ ملایا ہے۔ اس

کے لیے بطور نمونہ حسب ذیل آیات ملاحظہ فرمائیں:

① اہلِ ایمان کی علامت: اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ (سورۂ سجدہ:۱۵) "ہماری آیات پر تو بس وہی لوگ ایمان رکھتے ہیں جب اُنھیں ان کی یاددہانی کرائی جاتی ہے تو وہ سجدہ میں گر جاتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں"۔

② ملائکہ کی عبادت: قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ (سورۂ بقرہ:۳۰) "ملائکہ نے کہا کہ کیا تو اُسے زمین پر خلیفہ بنائے گا جو زمین میں فساد کرے گا اور خون ریزی کرے گا اور ہم تیری تسبیح کے ساتھ حمد کرتے ہیں اور تیری تقدیس کرتے ہیں"۔

③ وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ (سورۂ زمر:۷۵) "تو دیکھے گا کہ فرشتے عرش کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے ہیں وہ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں"۔

④ اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ (سورۂ غافر:۷) "وہ جو عرش کو اُٹھائے ہوئے ہیں اور جو اس کے گرداگرد ہیں وہ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں"۔

⑤ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِى الْاَرْضِ (سورۂ شوریٰ:۵) "اور ملائکہ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور زمین میں رہنے والوں کے لیے استغفار کرتے ہیں"۔

⑥ تسبیحِ رعد: وَ يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ (سورۂ رعد:۱۳) "رعد (کڑک) خدا کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتی ہے اور ملائکہ اس کے خوف

سے تسبیح کرتے ہیں"۔

⑦ نبی اکرمؐ کے لیے حکمِ الٰہی: فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ كُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ (سورۂ حجر:۹۸) "اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر اور سجدہ کرنے والوں میں سے بن جا"۔

⑧ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا (سورۂ طٰہٰ:۱۳۰) "سورج طلوع ہونے سے قبل اور اس کے غروب سے قبل اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرو"۔

⑨ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ (سورۂ غافر:۵۵) "تو اپنی کمزوری کے لیے مغفرت طلب کر اور صبح وشام اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کر"۔

⑩ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ (سورۂ قٓ:۳۹) "سورج کے طلوع وغروب سے قبل اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ تسبیح کر"۔

⑪ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ (سورۂ طور:۴۸) "جب آپ اٹھیں تو اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کریں"۔

⑫ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ (سورۂ نصر:۳) "آپ اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کریں اور اس سے استغفار کریں"۔

عملِ رسولؐ

آیئے دیکھیں اس حمد وتسبیح کے اجتماع پر حبیبِ خدا نے کس طرح سے عمل کیا تھا:

① عن عقبة بن عامر...... كان رسول الله اذا ركع
قال سبحان ربی العظیم وبحمده ثلاثا واذا سجد
قال سبحان ربی الاعلٰی وبحمده ثلاثا

''عقبہ بن عامر نے کہا کہ رسولؐ خدا جب رکوع کرتے تو آپ رکوع میں تین بار سبحان ربی العظیم وبحمده پڑھتے تھے اور جب سجدہ میں جاتے تو تین بار سبحان ربی الاعلٰی وبحمده پڑھتے تھے''۔ (ابوداؤد، جلداول، باب ۳۰۱، حدیث ۸۶۱)

اس حدیث کے متعلق امام ابوداؤد نے یہ تبصرہ کیا ہے:

هذه الزيادة نخاف ان لا تكون محفوظة

''یہ اضافہ ہے ہمیں یہ خدشہ ہے کہ کہیں بات محفوظ نہ رہی ہو''۔

مقصد یہ ہے کہ ابوداؤد کو یہ خدشہ تھا کہ کہیں ''وبحمدہ'' کی زیادتی محفوظ نہ ہو۔ لیکن یہ صرف ابوداؤد کا وہم تھا۔ محدثین نے اس کی اس طرح سے وضاحت کی ہے۔

أ: امام شوکانی لکھتے ہیں:

وهذه الطرق تتعاضد فيرديها هذا الانكار اعاروى انكار زيادة بلفظ ''وبحمده'' من ابی داؤد بن صلاح

''طریق حدیث ایک دوسرے کی تقویت کرتے ہیں، لہٰذا ''وبحمدہ'' کے لفظ پر ابوداؤد نے جو اعتراض کیا ہے وہ اعتراض بے معنی اور بیکار ہے''۔ (نیل الاوطار شوکانی، جلد۲/۱۳۹)

ب: نصب الرایہ، ص۷۹ پر مرقوم ہے:

کان رسول اللّٰہ اذا رکع قال سبحان ربی العظیم وبحمدہ ثلاث مرات

"جب رسول اکرمؐ رکوع کرتے تو اس میں تین بار سبحان ربی العظیم وبحمدہ پڑھتے تھے"۔ (رواہ دار قطنی، طبرانی، حاکم و امام احمد)

ج: مذہب اہلِ حدیث کے علامہ زبیر علی زئی کی تحقیق کی کتاب نمازِ نبویؐ کے ص ۱۸۵-۱۸۶ پر مرقوم ہے: "سبحان ربی العظیم وبحمدہ (میرا بلند پروردگار پاک ہے میں اس کی حمد کرتا ہوں) کے کلمات کو امام ابن حبان نے صحیح کہا ہے"۔

اہلِ سنت کی اختلافی روایات اور ان کی حقیقت

۱- عن عقبة بن عامر قال لما نزلت "فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ" قال رسول اللّٰہ (ص) اجعلوها فی رکوعکم......

"عقبہ بن عامر کا بیان ہے کہ جب سورۂ واقعہ کی آیت فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ نازل ہوئی تو رسولؐ خدا نے فرمایا کہ اسے اپنے رکوع میں کہا کرو۔ اور جب سبح اسم ربك الاعلى کی آیت نازل ہوئی تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اسے سجدہ میں پڑھا کرو۔ (سنن ابی داؤد، جلد اول، کتاب الصلاۃ، حدیث ۸۶۰، باب ۳۰۱)

اب آئیے اس روایت کی علمی حیثیت پر توجہ دیں۔

امام ناصر الدین البانی کی تحقیق کے مطابق فقہ الحدیث مرتبہ حافظ عمران ایوب جلد اول، کتاب الصلاۃ، ص ۴۱۷ پر اس حدیث کے متعلق لکھا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے:

۲ عن عبداللّٰہ بن مسعود قال قال رسول اللّٰہ اذا رکع احدکم فلیقل ثلاث مرات سبحان ربی العظیم وذٰلک ادناہ فاذا سجد فلیقل سبحان ربی الاعلیٰ ثلاثا وذٰلک ادناہ

''ابن مسعود کا بیان ہے کہ حضرت رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی رکوع کرے تو تین مرتبہ سبحان ربی العظیم کہے اور یہ کم سے کم ہے اور جب کوئی سجدہ کرے تو اسے چاہیے کہ کم از کم تین مرتبہ سبحان ربی الاعلیٰ کہے''۔ (سنن ابوداؤد، جلد اول، حدیث ۸۷۷، باب ۳۰۴۔ ابن ماجہ، جلداول، باب ۲۳۳، حدیث ۹۳۷)

اس حدیث کی علمی حیثیت کو ملاحظہ فرمائیں:

۱ امام ترمذی نے جامع ترمذی باب ماجاء فی التسبیح فی الرکوع والسجود، حدیث ۲۴۸ میں اس روایت کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ابن مسعود کی حدیث کی سند متصل نہیں ہے، کیونکہ عون بن عبداللہ بن عتبہ نے ابن مسعود سے ملاقات ہی نہیں کی تھی۔ (تو ان سے یہ حدیث کیسے روایت کی؟)

۲ فقہ الحدیث (جلد اول، کتاب الصلاۃ، ص ۴۱۶) میں لکھا ہے کہ حدیث

ابن مسعود ضعیف ہے۔

۳ امام ابوداؤد نے سنن میں اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھا:

قال ابوداؤد وهذا مرسل عون لم يدرك عبد الله

"یہ حدیث مُرسَل ہے کیونکہ عون نے عبداللہ ابن مسعود کو نہیں پایا تھا"۔

۴ حدیقۃ الاظہار علامہ محمد داؤد (جلداول/۴۰۳) میں ہے کہ یہ روایت مُرسَل ہے کیونکہ عون کی ملاقات ابن مسعود سے ثابت نہیں ہے۔

۵ مشکوٰۃ شریف (جلداول، مترجم علامہ عابد الرحمٰن کاندھلوی) میں حدیث ابن مسعود کے بعد لکھا ہے کہ اس کی اسناد متصل نہیں ہیں کیونکہ عون ابن مسعود سے نہیں ملے تھے۔

ذکرِ رکوع وسجود کے متعلق ائمہ اہلِ بیتؑ کا فتویٰ

فقہ الرضا میں مرقوم ہے کہ جب تم رکوع میں جاؤ تو تین بار سبحان ربی العظیم وبحمدہ تین بار پڑھو۔ اگر چاہو تو پانچ مرتبہ پڑھو اور اگر چاہو تو سات مرتبہ پڑھو اور اگر چاہو تو نو بار پڑھو اور یہ افضل ہے۔ (مستدرک الوسائل، جلداول، ابواب الرکوع، باب ۲، حدیث ۶، ص ۳۲۲-۲۹۲)

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ سجدہ میں تین بار سبحان ربی الاعلیٰ وبحمدہ کہو، حوالہ دعائم الاسلام۔

قال ابوجعفر عليه السلام اتدری ای شئی حد الرکوع والسجود؟ قلت لا — قال التسبیح فی

الرکوع ثلاث مرات سبحان ربی العظیم وبحمدہ وفی السجود سبحان ربی الاعلیٰ وبحمدہ ثلاث مرات

''حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: کیا تو جانتا ہے کہ رکوع وسجود کی حد کیا ہے؟ میں نے عرض کیا: نہیں۔ آپؑ نے فرمایا: رکوع میں تین بار سبحان ربی العظیم وبحمدہ کہو اور سجدہ میں تین بار سبحان ربی الاعلیٰ وبحمدہ تین بار کہو''۔ (فروع کافی، جلد اول، باب ذکر الرکوع والسجود، حدیث اول، استبصار، جلد اول/١٦٥)

قال ابوجعفر علیہ السلام من قال فی رکوعہ وسجودہ وقیامہ اللھم صل علیٰ محمد وآل محمد کتب اللہ لہٗ ذٰلک بمثل الرکوع والسجود والقیام

''جو شخص رکوع، سجود اور قیام میں (ذکر وقراءت کے بعد) اللھم صل علیٰ محمد وآل محمد کہے تو اللہ اُسے قیام، رکوع اور سجدہ کے برابر اور ثواب عطا کرے گا''۔ (ثواب الاعمال، شیخ صدوق رضوان اللہ علیہ، ص ۷۵)

❋❋❋

maablib.org

باب نہم

سجدہ کس پر کرنا چاہیے؟

مکتب خلافت کے پیروکار عام طور پر کپڑے پر سجدہ کرتے ہیں، جب کہ کچھ مسالک کے نزدیک سجدہ کے لیے مٹی ہی افضل ترین چیز ہے اور کپڑے پر سجدہ کرنا ممنوع ہے۔

آیئے حدیث نبویؐ کی روشنی میں دیکھیں کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ پہلے ہم اپنے بھائیوں کے دلائل پیش کرتے ہیں، جن میں کپڑے پر سجدہ کا جواز ملتا ہے۔

آیئے پہلے کپڑے پر جواز کی روایت پر نظر ڈالیں:

حدثنا ابو الولید ھشام بن عبدالملک قال اخبرنا بشر بن المفضل قال حدثنی غالب القطان عن بکر بن عبداللہ عن انس بن مالک قال کنا نصلی مع النبی (ص) فیضع احدنا طرف الثوب من شدۃ الحر فی مکان السجود

"(بحذف اسناد) حضرت انس بن مالک نے فرمایا: ہم نبی اکرمؐ کے ساتھ نماز پڑھتے تو شدت گرما کی وجہ سے ہم میں سے ایک اپنے کپڑے کے کنارے کو سجدہ کی جگہ رکھ لیتا تھا"۔

(صحیح بخاری، جلد اول، کتاب الصلاۃ، باب ۲۶۴/۲۲۷، حدیث ۳۷۵، لاہور)

روایت کا تجزیہ

حضرت انس کی مندرجہ بالا روایت میں سب سے غور طلب پہلو یہ ہے کہ اس میں جس عمل کا ذکر ہو رہا ہے وہ آنحضرت کا عمل نہیں اور نہ ہی جملہ صحابہ کرام کا عمل ہے بلکہ صحابہ کرام کی جماعت میں سے کسی ایک فرد کے عمل کا ذکر ہو رہا ہے۔

حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ رسولؐ خدا اور صحابہ زمین پر سجدہ کر رہے تھے کہ ان میں سے ایک صحابی کو گرمی کی زیادہ شدت محسوس ہوئی اور اُنھوں نے اپنے کپڑے کو سجدہ کی جگہ رکھ کر سجدہ کر لیا تھا۔

روایت کا اسلوب اس امر کا گواہ ہے کہ ایک فرد کا عمل ہے۔ رسول اکرمؐ اور صحابہ نے زمین پر ہی سجدہ کیا تھا اور ویسے بھی یہ ایک اضطراری عمل ہے اور اضطرار کے وقت حرام چیزیں بھی حلال ہو جاتی ہیں۔ لطف یہ ہے کہ صحیح بخاری کی اس حدیث میں اس صحابی کا نام بیان نہیں کیا گیا، لیکن حدیث کی بعض کتابوں میں انس کی یہ روایت موجود ہے اور وہاں یہ تشریح بھی موجود ہے کہ راوی نے انس سے اس صحابی کا نام پوچھا تھا۔ انس نے اس کا نام "افلح" بیان کیا تھا۔

راوی کا پوچھنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ صحابہ کا عمومی عمل نہیں تھا، عمل شاذ تھا اسی لیے راوی کو نام پوچھنا پڑا تھا۔

روایات کی وسیع دنیا میں ایک ہی فرد ہیں جن کا نام "افلح" تھا۔ اُنھوں نے یہ عمل بحالتِ مجبوری سرانجام دیا تھا، جب کہ خود افلح راوی ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے یہ فرمایا تھا۔ چنانچہ حدیث کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

عن افلح ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم قال لافلح: ترب وجھک ای فی سجودک

”رسول کریمؐ نے فرمایا: اے افلح! سجدہ کی حالت میں اپنی پیشانی کو خاک آلود کیا کرو“۔ (نیل الاوطار شوکانی، جلد۲/۱۸، طبع مصر)

لہٰذا اطاعت نبویؐ کا تقاضا ہے کہ کپڑے کے بجائے انسان کو خاک پر سجدہ کرنا چاہیے۔ خاک پر سجدہ کرنے سے خاکساری پیدا ہوتی ہے اور انسان میں عجز و نیاز پیدا ہوتا ہے، جب کہ قالینوں کے مصلّٰی پر یہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام اور نبی اکرمؐ زمین پر ہی سجدہ کرتے تھے۔

عن عروہ بن زبیر انه کان یکرہ ان یسجد علی شئی دون الارض (نیل الاوطار، جلد۲/۱۸)

”عروہ بن زبیر زمین کے علاوہ کسی دوسری چیز پر سجدہ کرنا مکروہ قرار دیتے تھے“۔

البتہ اگر نمازی کپڑے کی جانماز پر کھڑے ہو کر نماز پڑھے اور سجدہ زمین یا زمینی اجزا پر کرے تو اس میں کوئی عیب نہیں ہے، جیسا کہ اس روایت میں بیان کیا گیا ہے۔

(بحذف اسناد) عن عبداللّٰہ بن عبدالرحمٰن قال جآء نا النبی فصلی بنا فی مسجد بن عبدالاشھل فرأیته واضعا یدیه علی ثوبه اذا سجد (ابن ماجہ، جلد اول/۳۱۲۔ ابواب اقامة الصلٰوة والسنة فیھا، باب ۲۸۷۔ حدیث ۱۰۲۹)

”حضرت عبداللّٰہ بن عبدالرحمٰن فرماتے ہیں: رسولؐ خدا ہمارے

ہاں تشریف لائے اور آپؐ نے ہمیں بنی عبدالاشہل کی مسجد میں نماز پڑھائی۔ میں نے دیکھا کہ سجدہ کے وقت آپؐ نے کپڑے پر سجدہ کیا ہوتا تو آپ کا صحابی اس کا ذکر بھی ضرور کرتا"۔

رسول اکرمؐ کا فرمان ہے:

ان افضل ما تسجد علیه الارض وما انبتته الارض

"سجدہ کرنے کے لیے سب سے بہتر چیز زمین ہے اور وہ چیز جو زمین سے پیدا ہوئی ہو"۔ (کنزالعمال، جلد۴/۱۱۳)

(بحذف اسناد) عن ابی سلمة قال سألت ابا سعید الخدری فقال رأیت رسول الله یسجد فی الماء والطین حتی رأیت اثر الطین فی جبهته

"ابوسلمہ کہتے ہیں کہ میں نے ابوسعید خدری سے سوال کیا تو اس نے بتایا کہ میں نے رسولؐ خدا کو دیکھا کہ آپؐ نے پانی اور مٹی میں سجدہ کیا، یہاں تک کہ میں نے مٹی کا نشان آپؐ کی پیشانی پر دیکھا" (صحیح بخاری، جلداول، کتاب الصلاۃ، باب ۳۸۹/۵۴۱)

(بحذف اسناد) حدثنا البرآء بن عازب وهو غیر کذوب قال کنا نصلی خلف النبی فاذا قال سمع الله لمن حمده لم یحن احدمنا ظهره حتی یضع النبی جبهته علی الارض

"ہم سے براء بن عازب نے بیان کیا وہ جھوٹا نہیں تھا اس

نے کہا کہ ہم نبی اکرمؐ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے اور جب آپؐ سمع اللہ لمن حمدہ کہتے تو ہم میں سے کوئی اپنی پیٹھ کو نہ جھکاتا، یہاں تک کہ آپؐ اپنی پیشانی کو زمین پر رکھ دیتے تھے"۔ (صحیح بخاری، جلداول، باب ۵۲۶/۳۸۰، حدیث ۷۷۱)

خُمرہ پر سجدہ

(بحذف اسناد) عن میمونة زوج النبی (ص) قالت کان النبی یصلی علی الخمرة

"عبیداللہ بن شداد سے روایت ہے کہ اُم المومنین میمونہ نے فرمایا کہ نبی اکرمؐ چھوٹی چٹائی پر نماز پڑھتے تھے"۔

روایت کا اسلوب اس امر کا متقاضی ہے کہ اُم المومنین وفاتِ پیغمبرؐ کے بعد عملِ رسولؐ کو بیان کر رہی ہیں۔

اسی مفہوم کی روایت حضرت اُم المومنین اُم سلمہؓ سے بھی منقول ہے۔ (ملاحظہ فرمائیں، صحیح بخاری، جلداول، کتاب الصلاۃ علی الخمرۃ، ص ۲۳۵، حدیث ۳۷۱، کنزالعمال، جلد۴/۱۲، ابن ماجہ، جلداول/۳۱۲، حدیث ۱۰۷۶، طبع لاہور)

حدثنا ابوکریب حدثنا ابومعاویة عن الاعمش عن ابی سفیان عن جابر عن ابی سعید قال صلی رسول اللہ علی حصیر

"ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ رسولؐ خدا نے چٹائی پر نماز پڑھی"۔ (ابن ماجہ، جلداول، باب الصلاۃ علی الخمرۃ، ص ۳۱۳،

حدیث ۱۰۷۷)

خُمرہ کیا ہے؟

مسلک اہلِ حدیث کے جید علامہ وحید الزمان صاحب نے اپنی کتاب "انوار اللغۃ" میں لکھا ہے، آنحضرتؐ نے اپنی بی بی حضرت اُم سلمہؓ سے فرمایا:

ناولینی الخُمرۃ من المسجد

"یعنی مسجد سے سجدہ گاہ اُٹھا دو"۔

"خُمرہ" کھجور کے پتوں سے بنے ہوئے اس چھوٹے سے ٹکڑے کو کہتے ہیں جس پر سجدے میں آدمی کا فقط سر آسکتا ہو۔

علامہ ابن اثیر نے جامع الاصول میں کہا ہے کہ خُمرہ وہ سجدہ گاہ ہے جس پر ہمارے زمانے میں شیعہ سجدہ کرتے ہیں۔

اس کے بعد علامہ وحید الزمان لکھتے ہیں: "میں کہتا ہوں کہ اس حدیث سے سجدہ گاہ رکھنا مسنون ٹھہرا اور جن لوگوں نے اس سے منع کیا ہے اور رافضیوں کا طریقہ قرار دیا ہے ان کا قول صحیح نہیں ہے۔ میں تو اتباعِ سنت کے لیے پنکھا بجائے سجدہ گاہ کے رکھ کر اس پر سجدہ کرتا ہوں اور جاہلوں کے طعن و تشنیع کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ ہمیں سنتِ رسولؐ سے غرض ہے، کوئی رافضی (شیعہ) کہے یا خارجی پڑا بکا کرے"۔ (انوار اللغۃ، پارہ ۷/۱۱۸)

قارئین کرام! گرمی کی شدت کے باعث عموماً رسولؐ خدا اور صحابہ کرام خُمرہ پر سجدہ کرتے تھے لیکن اس کے باوجود صحابہ کرام کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ مٹی پر سجدہ کیا جائے، کیونکہ مٹی پر سجدہ افضل ترین عمل ہے۔ اس بات کا اندازہ حسب ذیل

روایت سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

عن جابر بن عبداللہ قال کنا نصلی مع رسول اللہ الظهر فاخذ قبضة من حصی فی کفی ابردہ ثم احوله فی کفی الاخر فاذا سجدت وضعته لجبهتی

"جابر بن عبداللہ کا بیان ہے کہ ہم آنحضرتؐ کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھتے تھے۔ میں کنکریوں کو اپنی مٹھی میں اُٹھا لیتا تھا اور اُسے ٹھنڈا کرنے کے لیے دوسری مٹھی میں لے جاتا تھا اور جب میں سجدہ کرتا تو ان کنکریوں کو پیشانی کی جگہ رکھ لیتا تھا"۔

(سنن نسائی، جلد اول/۳۵۱، کتاب الافتتاح، حدیث ۱۰۵۸)

اب لمحہ فکریہ ہے کہ اگر کپڑے پر سجدہ کرنا حلال ہو تو صحابی گرم کنکریاں ہاتھوں میں کیوں اُٹھاتے اور انھیں ہتھیلیوں میں بدل بدل کر ٹھنڈا کرنے کی زحمت کیوں کرتے؟! جب کہ کپڑے پر سجدہ کرنا تو انتہائی آسان تھا۔

ہماری اس تمام تر بحث کا خلاصہ یہ ہے مٹی پر سجدہ کرنا ہی افضل ترین عمل ہے۔ اسی لیے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں:

اس سے زیادہ تعظیم جس کو تعظیم کی انتہا کہنا چاہیے، وہ یہ ہے کہ آدمی اپنے چہرے کو جو اس کے جسم کا شریف ترین حصّہ ہے فرشِ خاک پر رکھ دے اور ماتھے کو زمین پر رگڑے۔ (حجۃ اللہ البالغہ، جلد اول/۳۰۱)

البتہ جب مٹی میسر نہ ہو تو مٹی سے نکلے ہوئے زمین کے اجزائے اصلیہ یعنی چٹائی، درخت کے پتوں اور لکڑی کے ٹکڑوں پر سجدہ کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ سنت رسولؐ میں کسی اور چیز پر سجدہ سنت رسولؐ نہیں ہے۔

ائمہ اہلِ بیتؑ کا فرمان

ائمہ اہلِ بیتؑ کے نزدیک افضل ترین سجدہ وہ ہے جو مٹی پر ادا کیا جائے اور جب کبھی مجبوری ہو تو چٹائی، درخت کا پتا اور لکڑی کے ٹکڑے پر بھی سجدہ جائز ہے۔

عبدالرحمٰن بن عبداللہ نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا کہ ایک شخص کے سر پر عمامہ ہو جس کی وجہ سے اس کی پیشانی زمین پر نہیں لگتی، اس کا شرعی حکم کیا ہے؟ امام علیہ السلام نے فرمایا: یہ کافی نہیں ہے جب پیشانی زمین پر نہ لگے سجدہ نہیں ہوگا۔ (فروع کافی، ثقۃ الاسلام کلینی، جلد۲/۷۰۔ حضرت دست غیب کی اسرار الصلاۃ)

علی بن جعفر نے اپنے بھائی حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے پوچھا کہ جو کھجور کے نیچے اُگے ہوئے پتوں پر نماز پڑھے تو اس کا کیا حکم ہے؟

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے فرمایا: اگر پیشانی زمین سے لگ جاتی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ پوچھا کہ گھنی گھاس پر نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

فرمایا: جب پیشانی زمین پر پہنچ جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ (فروع کافی، جلد۲/۹۳، ترجمہ اُردو، کراچی)

سجدہ کی حکمت

جب ہم سجدے کی حکمت پر غور کرتے ہیں تو دو سوالات ذہن میں اُبھرتے ہیں جن کا بظاہر آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے:

۱۔ ایک رکعت میں باقی اعمال مثلاً قیام، رکوع وغیرہ ایک ایک مرتبہ ہیں، لیکن سجدہ وہ عمل ہے جسے ہر رکعت میں دو مرتبہ ادا کرنا پڑتا ہے۔

۲۔ افضل ترین سجدہ مٹی پر ہی کیوں ہے؟

آیئے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کریں کہ ان کا آپس میں کیا تعلق ہے اور اس کے پس پردہ کون سی حکمت کارفرما ہے؟

سجدہ میں دراصل خداوند عالم بندے سے حیات بعد الموت کے عقیدے پر یقین کا اظہار عملی طور پر کروا رہا ہے۔ یعنی پہلا سجدہ علامت ہے کہ میں (نمازی) اسی مٹی سے پیدا ہوا ہوں اور جب نمازی پہلے سجدہ سے اُٹھ کر بیٹھتا ہے تو دونوں سجدوں کے درمیان کا وقفہ دنیاوی زندگی کی علامت ہے اور اس میں اس سے کوتاہی اور لغزش صادر ہوتی ہے، اسی لیے حکم ہے کہ اس درمیانی وقفہ میں استغفراللہ ربی واتوب الیہ پڑھنا چاہیے۔

دوسرا سجدہ علامت ہے کہ مجھے پھر اسی مٹی میں واپس جانا ہے اور اسی سے ہی مجھے دوبارہ اُٹھایا جائے گا۔

جیسا کہ قرآن حکیم یہ کہتا ہے:

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۝ (سورہ طٰہٰ:۵۵)

"ہم نے تمھیں اسی زمین سے پیدا کیا ہے اور اسی میں تمھیں پلٹائیں گے اور پھر دوسری بار تمھیں اسی سے ہی برآمد کریں گے"۔

اور سیدھی سی بات ہے کہ جب کوئی نمازی مٹی کو چھوڑ کر اور اشیا پر سجدہ کرتا ہے تو وہ اس عظیم القدر فلسفہ سے بہت دُور ہو جاتا ہے۔

شرف جس کو نہ ہو مقبولیت کا
وہ سجدہ کیا ہے توہینِ جبیں ہے

***

باب دہم

دوسرے سجدہ کے بعد کیسے اُٹھنا چاہیے؟

دوسرے سجدہ کے بعد اُٹھنے کے لیے مسلمانوں میں دو طریقے رائج ہیں:

① اگلی رکعت کے لیے کھڑے ہوتے وقت پہلے ہاتھوں کو اُٹھاتے ہیں، اس کے بعد گھٹنوں کو زمین سے اُٹھاتے ہیں یعنی پاؤں کے پنجوں کے بل کھڑے ہوتے ہیں۔

② اگلی رکعت کے لیے کھڑے ہوتے وقت پہلے گھٹنوں کو زمین سے اُٹھاتے ہیں بعد میں ہاتھوں کو زمین سے، یعنی ہاتھوں کی ہتھیلیوں کے سہارے کھڑے ہوتے ہیں۔

آیئے دونوں طریقوں کے استدلال میں جو حدیثیں پیش کی جاتی ہیں، ان کا جائزہ لیتے ہیں، تاکہ واضح ہو سکے کہ ان میں سے کون سا طریقہ سنتِ رسولؐ کے مطابق ہیں اور کون سا سنت کے خلاف ہے اور ہمیں چاہیے کہ ہم وہ طریقہ اختیار کریں جو سنتِ رسولؐ کے مطابق ہو۔

پہلے طریقے کی حدیث اور اس کا علمی جائزہ

پنجوں کے بل کھڑا ہونے کی تائید میں یہ وہ حدیث ہے جو جامع ترمذی میں مرقوم ہے۔ اس کے علاوہ اس عمل کی تائید کے لیے کوئی اور حدیث نہیں ملتی۔

عن خالد بن الیاس عن صالح عن ابی ھریرۃ قال

كان النبي (ص) ينهض في الصلاة على صدور قدميه

"خالد بن الیاس نے صالح سے روایت کی ہے کہ اس نے ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز میں دونوں قدموں کے سروں پر اُٹھتے تھے۔ یعنی پیروں کی انگلیوں پر زور دے کر اُٹھا کرتے تھے۔ (جامع ترمذی، جلد اول، ابواب الصلاۃ، باب کیف النھوض من السجود، ص ۱۶۷)

آئیے اب اس حدیث کا علمی جائزہ لیں اور دیکھیں کہ کیا یہ روایت صحیح ہے یا ضعیف؟

امام ابوعیسیٰ ترمذی نے اس حدیث کو لکھنے کے بعد خود لکھا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس حدیث کے دو راوی ہیں: پہلے کا نام خالد بن الیاس ہے اور دوسرے کا نام صالح ہے۔ ان دونوں راویوں کے متعلق علمائے محدثین کی آراء کا جائزہ لیتے ہیں۔

① خالد بن الیاس، ان کا پورا نام خالد بن الیاس مدنی ہے۔ انھیں خالد بن ایاس بھی کہا جاتا ہے۔

امام بخاری ان کے متعلق فرماتے ہیں:

قال البخاری لیس بشئی

"کہ یہ کوئی شے نہیں ہے، مقصد یہ ہے کہ اس کی کوئی حیثیت نہیں"۔

امام احمد بن حنبل اور امام نسائی فرماتے ہیں:

قال احمد والنسائی متروك

"یہ متروک ہے یعنی یہ اس قابل نہیں ہے کہ اس سے احادیث لی جائیں، یہ متروک الحدیث ہے"۔

امام یحییٰ بن معین کہتے ہیں:

لیس بشئی ، لا تکتب حدیثه

"اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے، اس کی بیان کردہ احادیث اس قابل نہیں کہ انھیں لکھا جائے"۔ (ملاحظہ فرمائیں، میزان الاعتدال ذہبی، جلد اول/ ۶۲۷، طبع بیروت)

اس حدیث کا دوسرا راوی "صالح" ہے۔ اس کے متعلق علمائے حدیث کی آرا کا جائزہ لیتے ہیں:

۲ صالح: ان کا پورا نام صالح بن نبھان المدنی ہے اور وہ التوءمۃ کے غلام تھے۔ ان کے متعلق ماہرین فن کے آراء حسب ذیل ہیں:

قال ابن حبان: هذا باطل

"امام ابن حبان کہتے ہیں کہ یہ شخص مجسم باطل تھا"۔

قال الاصمعی کان شعبة لا یروی عنه وینهی عنه

"اصمعی کا بیان ہے کہ امام شعبہ اس سے روایت نہیں لیتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کی روایت قبول کرنے سے منع کرتے تھے"۔

وقال بشر بن سعد: سألت مالکا عنه فقال لیس بثقة

"بشر بن سعد نے بیان کیا کہ میں نے امام مالک سے اس کے متعلق پوچھا تو انھوں نے کہا کہ وہ ثقہ نہیں ہے"۔

وروی عبد اللہ بن احمد عن یحیی بن معین لیس بقوی

''عبداللہ بن احمد بن حنبل نے یحییٰ بن معین سے روایت کی ہے، انھوں نے کہا کہ صالح قوی نہیں ہے''۔

وقال یحیی القطان لم یکن بثقة

''یحییٰ قطان نے کہا کہ وہ کبھی بھی ثقہ یعنی قابلِ وثوق نہیں رہا''۔

قال ابوحاتم: لیس هو بقوی

''امام ابوحاتم کا قول ہے کہ صالح مضبوط راوی ہے''۔

قال ابن حبان: تغیر فی سنة خمس وعشرین ومائة وجعل یاتی بما یشبه الموضوعات عن الثقات فاختلط حدیث الاخیر بحدیثه القدیم ولم یتمیز فاستحق الترك

''امام ابن حبان فرماتے ہیں کہ ۱۲۵ھ میں صالح میں تغیر پیدا ہوا۔ وہ ثقہ لوگوں کا نام لے کر ایسی روایات نقل کرنے لگا جو کہ گھڑی ہوئی احادیث سے مشابہ ہوتی تھیں اور اس کے بعد کی احادیث پہلی احادیث سے مل جل گئیں اور ان میں باہمی فرق کرنا ناممکن ہوگیا اس لیے علما نے اس سے احادیث لینا بند کر دیں''۔

وقال النسائی ضعیف

''امام نسائی فرماتے ہیں کہ یہ ضعیف ہے''۔

صالح کے متعلق مذکور تمام آرا کے لیے ملاحظہ فرمائیں: (میزان الاعتدال فی نقد الرجال، جلد دوم/۳۰۳، طبع بیروت)

دعوتِ انصاف

پنجوں کے بل کھڑے ہونے کے لیے صرف ایک ہی حدیث ہے اور اس کے راوی خالد بن الیاس اور صالح ہیں، ان میں سے ایک ضعیف اور متروک ہے اور دوسرا اخیر سے مجسم باطل ہے تو ایسے راویوں کے بیان کو عمل کی بنیاد کیسے بنایا جاسکتا ہے۔

ع جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اور کیا کسی فقیہہ کو یہ بات زیب دیتی ہے کہ وہ ایسی ضعیف حدیث کو اپنے فتویٰ کی بنیاد قرار دے؟

اس حدیث کے متعلق علامہ محمد داؤد دراز دہلوی شرح بخاری میں لکھتے ہیں: اس کی سند میں خالد بن الیاس راوی محدثین کے نزدیک ضعیف ہے اور یہ ضعیف حدیث صحیح بخاری، ترمذی، ابوداؤد اور نسائی کی صحیح حدیث کے خلاف ہے، لہٰذا قابلِ استدلال نہیں ہوسکتی۔ (شرح بخاری علامہ محمد داؤد از کتاب الصلاۃ، جلد اول/۳۹۰)

دوسرے طریقے کی حدیث

حدثنا معلّی بن اسد قال حدثنا وهيب عن ايوب عن ابی قلابة قال جآء نا مالك بن الحويرث فصلّی بنا فی سجدنا هذا فقال انی لاصلی بكم وما اريد الصلاة لكنی اريد ان اريكم كيف رايت رسول اللّٰه (ص) يصلی قال ايوب فقالت لابی قلابة وكيف كانت صلاته قال مثل صلاة شيخنا هذا يعنی عمرو بن سلمة قال ايوب وكان ذٰلك الشيخ يتم

التكبير واذا رفع رأسه عن السجدة الثانية جلس واعتمد على الارض ثم قام

''ابوقلابہ راوی ہیں کہ (صحابی رسولؐ) حضرت مالک بن حویرث ہمارے پاس آئے اور انھوں نے ہمیں ہماری مسجد میں نماز پڑھائی اور کہا کہ میں تمھیں اس لیے نماز پڑھا رہا ہوں، تاکہ تمھیں دکھاؤں کہ نبی اکرمؐ کس طرح نماز پڑھتے تھے۔

ایوب کا بیان ہے کہ میں نے ابوقلابہ سے پوچھا کہ ان کی نماز کیسی تھی؟ ابوقلابہ نے کہا: ان کی نماز ہمارے اس بزرگ عمرو بن سلمہ جیسی تھی۔

ایوب کہتے ہیں کہ وہ بزرگ پوری تکبیریں کہتے تھے اور جب وہ دوسرے سجدے سے سر اُٹھاتے تو تھوڑی دیر بیٹھتے پھر زمین سے ہاتھوں کا سہارا لے کر کھڑے ہوتے تھے''۔ (صحیح بخاری، جلد اول/۳۸۴، کتاب الصلاۃ، باب ۵۳۴، حدیث ۷۸۳، طبع لاہور، سنن ابی داؤد۔ جلد اول/۳۲۹، باب ۳۲۹، حدیث ۸۴۳، طبع لاہور)

اس حدیث کی سند صحیح ہے اور یہ حدیث بیک وقت تین احادیث کے برابر ہے، کیونکہ اس میں ایک صحابی حضرت مالک بن حویرث سنتِ رسولؐ کا عملی مظاہرہ کر کے لوگوں کو دکھا رہے ہیں۔ دوسرے سجدہ کے بعد وہ تھوڑی دیر زمین پر بیٹھتے ہیں۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ کیا ہم بھی دوسرے سجدے کے بعد تھوڑی دیر کے لیے بیٹھتے ہیں یا فوراً کھڑے ہو جاتے ہیں؟

اس کے بعد مالک ہاتھوں کا سہارا لے کر اگلی رکعت کے لیے کھڑے ہوتے ہیں۔ مالک کے عمل کی تصدیق دوسرے صحابی عمرو بن سلمہ کے عمل سے بھی ہوتی ہے۔ اس حدیث کی اضافی خوبی یہ ہے کہ اس میں سنتِ رسولؐ کے ساتھ ساتھ تو صحابہ کرام کے عمل کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔

ایک عالم کا اعتراف

علامہ وحید الزمان لکھتے ہیں: کوئی صحیح مرفوع حدیث سے ان ائمہ کے قول کی تائید نہیں ہوتی۔ ایک ابوہریرہ کی حدیث ہے جس کو ترمذی نے روایت کیا کہ رسولؐ خدا نماز میں قدموں کے کنارے پر اُٹھتے تھے اور ترمذی نے کہا کہ اس پر عمل ہے اہلِ علم کا، مگر یہ حدیث ضعیف ہے، بہ سبب خالد بن الیاس کے۔ (شرح سنن ابی داؤد، جلد اول/۳۲۹)

ائمہ اہلِ بیتؑ کا طریقہ

عن ابی بکر الحضرمی قال قال ابو عبد اللّٰہ اذا قمت من الرکعة فاعتمد علی کفیك وقل "بحول اللّٰہ وقوته اقوم واقعد" فان علیا کان یفعل ذٰلك

"ابوبکر حضرمی راوی ہیں کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: جب تم ایک رکعت ختم کر کے اُٹھو تو اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں کا سہارا لے کر اُٹھو اور اُٹھتے وقت: بحول اللّٰہ وقوته اقم واقعد کہو۔ حضرت علیؑ ایسا ہی کرتے تھے"۔ (فروع کافی، جلد۲/۱۰۳، طبع کراچی)

باب یازدہم

تشہد وسلام

دو رکعتی نماز کی آخری رکعت میں اور تین چار رکعتی نمازوں کی دوسری اور آخری رکعت کے دوسرے سجدے کے بعد بیٹھنے کو "قعدہ" کہا جاتا ہے اور اس دوران توحید ونبوت کی جو گواہی دی جاتی ہے اُسے تشہد کہتے ہیں۔

ان دونوں تشہدوں کی حیثیت کے بارے میں مختلف مسالک کا آپس میں اختلاف ہے۔ کچھ ان دونوں کو واجب قرار دیتے ہیں۔ کچھ دونوں کو سنت اور کچھ ایک کو سنت اور ایک کو واجب قرار دیتے ہیں۔

آیئے پہلے ائمہ اربعہ اور ان کے بعد ائمہ اہل بیتؑ کے اقوال کا جائزہ لیتے ہیں:

ائمہ اربعہ اور تشہد

تشہد کی حیثیت کے بارے میں ائمہ اربعہ کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے:

① امام ابوحنیفہ پہلے تشہد کو سنت اور دوسرے کو واجب قرار دیتے ہیں۔

② امام شافعی پہلے تشہد کو سنت اور دوسرے کو فرض قرار دیتے ہیں۔

③ امام حنبل پہلے تشہد کو واجب اور دوسرے کو فرض قرار دیتے ہیں۔

④ امام مالک دونوں کو سنت قرار دیتے ہیں۔ (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ، جلد اول/۳۷۳۔ در المختار، ص ۳۵۶۔ شرح صحیح مسلم، امام نووی، جلد۲/ ۲۹۔ ۸۵، طبع لاہور

فرض اور واجب کا فرق

مالکیہ اور شافعیہ واجب اور فرض دونوں کا ایک ہی معنی قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک نماز میں واجبات نہیں ہیں۔ اعمالِ نماز میں تو فرائض ہیں یا سنتیں ہیں۔ حنفیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ نماز میں واجبات ہوتے ہیں اور واجب کی تعریف یہ ہے کہ جس عمل کو رسولؐ خدا نے ہمیشہ جاری رکھا ہو۔

● مسلکِ حنفیہ: مسلکِ حنفیہ کے نزدیک نماز کا امر واجب ترک کرنے سے نماز باطل نہیں ہوتی، البتہ نمازی سے اگر سہواً ترک واجب ہوا ہے تو لازم ہے کہ سلام پھیرنے کے بعد سجدہ سہو کرلے اور اگر قصداً ترک کیا ہے تو نماز کا دوبارہ پڑھنا واجب ہے اور اگر دوبارہ نہ پڑھی گئی تو گناہ لازم ہوگا۔

● مسلکِ حنابلہ: اس مسلک میں نمازیں واجب کی حیثیت فرض سے کم ہے، یعنی اگر اس کو جان بوجھ کر قصداً ترک کیا جائے تو نماز باطل ہوجائے گی اور اگر سہواً یا بے خبری کی وجہ سے ترک ہوجائے تو نماز باطل نہ ہوگی اور سہواً ترک ہونے کی صورت میں سجدہ سہو واجب ہے۔ (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ، جلداول/۳۷۹-۳۸۱، جامعۃ الازہر، مصر)

ائمہ اہلِ بیتؑ اور تشہد

ائمہ اہلِ بیتؑ کے نزدیک دو رکعتی نماز میں ایک اور باقی تین یا چار رکعتی نماز میں دونوں تشہد فرض ہیں۔ بھول کی صورت میں سجدہ سہو لازم ہے اور ائمہ اہلِ بیتؑ کی نظر میں واجب اور فرض کا ایک ہی معنی ہے۔

تشہد میں شہادتین کے بعد درود پڑھے اور ائمہ اہلِ بیتؑ کے مطابق تشہد

میں درود کا پڑھنا فرض ہے اور اس کے بغیر نماز قبول نہیں ہوتی۔

درود اور ائمہ اربعہ

امام شافعی اور امام حنبل کے نزدیک تشہد میں درود پڑھنا واجب ہے، جب کہ امام ابوحنیفہ اور مالک تشہد میں درود پڑھنے کو سنت کا درجہ دیتے ہیں۔ (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ، جلد اول/ ۳۷۷۔ شرح نووی، جلد ۲/ ۳۲)

امام شافعی نے اس سلسلہ میں یہ شعر بھی کہے تھے:

یا اهل بیت رسول الله حبکم
فرض من الله فی القرآن انزله
کفاکم من عظیم القدر انکم
من لم یصلّ علیکم لاصلاة له

"اے اہلِ بیت رسولؐ! آپؑ کی محبت کو خدا نے فرض کیا ہے اور قرآن میں اُسے نازل کیا ہے۔ آپؑ کی قدر و منزلت کی بلندی کے لیے یہی بات کافی ہے کہ جو آپؑ پر نماز نہ پڑھے اس کی نماز قبول نہیں ہوتی"۔

درود کے لیے رسولؐ خدا کا فرمان

عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص ایسی نماز پڑھے جس میں مجھ پر اور میرے اہلِ بیتؑ پر درود نہ پڑھا جائے تو اس کی نماز کبھی قبول نہ ہوگی"۔

اس حدیث کی روشنی میں آنحضرتؐ پر درود پڑھنا فرض ہے، کیونکہ اس کے بغیر نماز قابلِ قبول نہیں ہے۔

تشہد میں درود اور صحابہ کرام اور تابعین

عن عمر انہ قال: لا یکون الصلاۃ الا بقراء ۃ وبتشہد وصلاۃ علی النبی والہ

"حضرت عمر بن خطاب فرماتے ہیں: نماز، قراءت وتشہد اور رسولؐ خدا اور ان کی آل پر درود پڑھے بغیر نہیں ہوسکتی"۔

(ملاحظہ فرمائیں، حافظ ابن حجر عسقلانی کی کتاب عمل الیوم واللیۃ، ص ۱۳۵)

امام بیہقی نے حضرت عمر کے قول کو حجت قرار دیا ہے۔ (شرح نووی، جلد ۲/۳۲، طبع کراچی)

رواہ ابن عبد البر عن ابن مسعود قال لا صلاۃ لمن لم یصل فیہا علی النبی والہ

"علامہ ابن عبدالبر نے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ جس شخص نے تشہد میں رسولؐ اللہ اور ان کی آل پر درود نہیں پڑھا اس کی نماز قبول نہیں ہوتی۔

(ارجح المطالب، ص ۳۰۲)

الغرض صحابہ کرام سے تواتر کے ساتھ روایات مروی ہیں کہ تشہد میں درود کا پڑھنا فرض ہے اور اس کے بغیر نماز باطل ہے۔

سلام

نماز کا اختتام سلام پر ہوتا ہے، لیکن سلام کی حیثیت اور اس کی ادائیگی کے

طریقے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

نماز کے اختتام پر سلام کی حیثیت کے بارے میں امام ابوحنیفہ اور باقی آئمہ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام شافعی، امام حنبل اور مسلک اہلِ حدیث اور امام مالک کے نزدیک سلام فرض ہے اور نماز کا ایک رکن ہے، جب کہ امام ابوحنیفہ سلام کو فرض قرار نہیں دیتے۔ وہ کہتے ہیں کہ نماز کے خلاف کوئی کام خواہ کوئی امر وضو توڑنے والا ہی سرزد کر کے نماز سے نکلنا فرض ہے۔

سلام مختلف فقہوں میں

● مسلکِ حنفیہ: فقہ حنفیہ میں "السلام" کہنے سے بغیر اس کے کہ "علیکم" کہا جائے، انسان نماز سے باہر آجاتا ہے، لیکن (ترکِ سلام) گناہ ہے اور نمازی کو چاہیے کہ وہ نماز دوبارہ پڑھ لے، اگر دوبارہ اس نے نماز نہ پڑھی تو وہ گناہ گار ہوگا۔

● مسلکِ حنبلی: فقہ حنبلی کے مطابق دو بار السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته کے الفاظ کو بعینہٖ اسی ترتیب سے کہہ کر سلام پھیرنا فرض ہے۔ اگر ایسا نہ کیا تو نماز باطل ہوجائے گی۔

● مسلکِ شافعیہ: فقہ شافعیہ میں سلام کے لیے یہ ترتیب فرض نہیں ہے، لہٰذا اگر ان الفاظ کی بجائے علیکم السلام کہا جائے تو نماز مکمل ہوجائے گی البتہ ترتیب اُلٹنا مکروہ ہے۔

● مسلکِ مالکی: فقہ مالکی کے مطابق نماز سے باہر آنے کے لیے ضروری ہے کہ لفظ السلام علیکم اسی ترتیب سے کہا جائے۔ (ملاحظہ فرمائیں کتاب الفقه علی المذاهب الاربعة، جلد اول/۳۷۶)

درالمختار، فتح الباری مختلف فقہوں کے فتاویٰ کو پڑھنے سے حسب ذیل باتیں واضح ہوتی ہیں:

① فقہ شافعیہ، حنبلیہ، مالکیہ اور مسلک اہلِ حدیث کے نزدیک نماز کے اختتام یا بالفاظ دیگر نماز سے باہر آنے کے لیے سلام فرض ہے۔ اور یہ بھی نماز کے باقی ارکان کی طرح سے ایک رکن ہے۔

② فقہ حنفیہ کے مطابق سلام ادا کرنا ضروری ہے۔ باقی مسالک کے مطابق کم از کم السلام علیکم پورا کہنا فرض ہے اور نماز کے کسی فرض یا رکن کی ادائیگی کے بغیر نماز باطل ہو جائے گی۔

اب سوال یہ ہے؟

مندرجہ بالا نکات کا جائزہ لینے کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نماز کے تمام فرائض اور ارکان قبلہ رُخ ہو کر ادا کئے جاتے ہیں اور کوئی فرض یا رکن ایسا نہیں جو قبلہ سے منہ پھیر کر ادا کیا جاتا ہو اور تمام مسالک اس بات پر متفق ہیں کہ اگر دورانِ نماز قبلہ سے رُخ پھر جائے تو نماز باطل ہو جاتی ہے۔

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

ومن حیث خرجت فول وجهك شطر المسجد الحرام وحیث ما کنتم فولوا وجوهکم شطره

”اور اے رسولؐ! آپؐ جہاں سے بھی نکلیں تو نماز میں اپنا منہ مسجد الحرام کی جانب کر لیا کریں اور اے مسلمانو! تم جہاں کہیں بھی ہوا کرو اپنا چہرہ کعبہ کی جانب کیا کرو“۔ (البقرہ:۱۵۰)

ارشاد خداوندی ہے:

واقیموا وجوھکم عند کل مسجد

"اور ہمیشہ سجدہ کے وقت اپنا رُخ کعبہ کی طرف رکھو"۔

مقصد یہ ہے کہ نماز کے تمام ارکان کے لیے روبقبلہ ہونا ضروری ہے، مثلاً جب آپ نماز کی نیت کرتے ہیں تو قبلہ رُخ ہو کر کرتے ہیں تکبیر تحریمہ نماز کا حصّہ ہے تو اس وقت بھی آپ قبلہ رُخ ہوتے ہیں اور قیام نماز کا حصّہ ہے تو اس وقت بھی آپ قبلہ رُخ ہوتے ہیں اور رکوع نماز کا حصّہ ہے تو اس وقت بھی آپ کا چہرہ قبلہ کی طرف ہوتا ہے اور سجدہ نماز کا حصّہ ہے تو اس وقت بھی آپ کا چہرہ قبلہ کی طرف ہوتا ہے اور تشہد نماز کا حصّہ ہے تو اس وقت بھی آپ کا چہرہ قبلہ کی طرف ہوتا ہے۔

نماز کا آخری رکن اور آخری فریضہ اسلام ہے تو یہاں بھی آپ کا رُخ قبلہ کی طرف ہونا چاہیے۔ یہاں آ کر چہرے کو دائیں بائیں پھیرنے کا کیا جواز ہے؟

لہٰذا سلام میں بھی چہرہ کا قبلہ رُخ ہونا ضروری ہے اور اختتامِ نماز پر سلام ان الفاظ سے کریں:

السلام علیك ایھا النبی ورحمة وبرکاته

السلام علینا وعلی عباد اللّٰه الصالحین

السلام علیکم ورحمته اللّٰه وبرکاته

اس کے بعد تین مرتبہ "اللہ اکبر" کہہ کر رفع یدین کریں اور نماز ختم کر دیں۔ یہی رسولِ خدا کا عمل تھا جیسا کہ اس حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔

حدثنا علی قال حدثنا سفیان قال حدثنا عمرة قال

أخبرنی ابومعبد مولٰی ابن عباس عن ابن عباس

قال كنت اعرف انقضاء صلاة النبی بالتكبير

"(بحذف اسناد) ابومعبد کا بیان ہے اور یہ ابن عباسؓ کے آزاد کردہ غلام تھے کہ ابن عباسؓ نے فرمایا: ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز کے ختم ہوجانے کو تکبیر سے جان لیا کرتے تھے"۔ (ملاحظہ فرمائیں: صحیح بخاری، جلداول/۳۹۰، کتاب الصلاۃ باب الذکر بعد الصلاۃ، حدیث ۷۹۹۔ صحیح مسلم، جلد۲/۱۴۴، کتاب المساجد باب السلام للتحلیل من الصلاۃ عند فراغھا وکیفیتہ، سنن ابی داؤد، جلداول/۳۸۳، پارہ ۶، باب ۳۴۲، حدیث ۹۸۹۔ مشکوٰۃ المصابیح، جلد۲/۱۹۔ فتح الباری، جلداول/۴۵۸۔ مستدرک حاکم، جلداول/۲۷۶۔ مسنداحمد، جلد۲/ ۳۹۸۔ تفسیر ابن کثیر، جلداول، پارہ۲، ص ۳۷)

اگر رسولؐ خدا اپنی نماز کا اختتام چہرے کو دائیں بائیں پھیر کر کیا کرتے تھے تو ابن عباسؓ یہ کبھی نہ فرماتے کہ ہم یعنی جماعت صحابہ نماز کے ختم ہوجانے کو تکبیر سے جان لیا کرتے تھے۔

نماز کے اختتام پر نمازی کو چاہیے کہ وہ محمدؐ وآل محمدؐ پر درود پڑھے، پھر حضرت خاتونِ جنت شفیعہ روزِ جزا حضرت فاطمۃ الزہراء سلام اللہ علیہا کی تسبیح پڑھے جس کا طریقہ یہ ہے کہ چونتیس مرتبہ اللہ اکبر، پھر تینتیس مرتبہ الحمدللہ، پھر تینتیس مرتبہ سبحان اللہ پڑھے اور آخر میں ایک دفعہ لا الہ الا اللہ پڑھے۔

اس کے بعد جتنی تعقیبات پڑھنا چاہے، پڑھے اور بعد میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگے کیونکہ دعا عبادت کا جوہر ہے۔ اللہ کو وہ عبادت اچھی نہیں لگتی جس میں دعا نہ ہو۔

باب دوازدہم

جمع بین الصلاتین

نماز کے متعلق جہاں اُمت اسلامیہ کے گروہوں میں اختلاف پایا جاتا ہے، وہاں اوقاتِ نماز میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے اور آج تک اُمتِ اسلامیہ کے علماء یہ طے کرنے میں ناکام رہے ہیں کہ ہر نماز کی فضیلت کا وقت کیا ہے اور کب ختم ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی ضمن میں جمع بین الصلاتین یعنی دو نمازیں جمع کرنے پر سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔

جمع بین الصلاتین سے مراد یہ ہے کہ انسان ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد عصر کی نماز پڑھے اور مغرب کی نماز کے بعد عشا کی نماز پڑھے اور دو نمازوں کو ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ ادا کرے۔

سچ یہ ہے کہ یہ مسئلہ بھی دوسرے بہت سے مسائل کی طرح سے افراط و تفریط کا شکار ہو چکا ہے اور حضرت حبیب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد سے لے کر آج تک پلوں میں بہت سا پانی بہہ چکا ہے۔

ہم یہ بات بہانگِ دہل اور علی وجہ البصیرت کہتے ہیں کہ حضرت حبیبؐ خدا نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں دونوں طرح سے نماز ادا کی تھی۔ آپؐ نے علیحدہ علیحدہ نمازیں بھی پڑھی تھیں اور جمع کر کے بھی نمازیں پڑھی تھیں، لیکن افراط و تفریط کا یہ نتیجہ نکلا کہ آج سنی بھائی یہ سمجھتا ہے کہ اگر کہیں میں نے جمع کر کے نمازیں پڑھ

لیں تو میں سنّی نہیں رہوں گا شیعہ بن جاؤں گا اور دوسری طرف سے شیعہ بھائی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے علیحدہ علیحدہ نمازیں پڑھ لیں تو پھر شیعہ نہیں رہیں گے سنّی بن جائیں گے۔

ہم اس باب میں جمع بین الصلاتین کے جواز اور عدمِ جواز پر تحقیق پیش کریں گے اور اس کے لیے ہم حکمِ الٰہی، سنتِ رسولؐ اور صحابہ کرام کے عمل کا جائزہ لیں گے۔

ہم اپنی بحث کا آغاز قرآنِ مجید سے کرتے ہیں۔

اوقاتِ نماز اور قرآن

قرآن کریم میں نمازوں کے اوقات کو پانچ مقامات پر بیان کیا گیا ہے:

① سورۂ ہود ② سورۂ بنی اسرائیل ③ سورۂ ق ④ سورۂ طٰہٰ ⑤ سورۂ روم۔

یہاں یہاں سورہ بنی اسرائیل کی آیتِ مجیدہ نقل کرتے ہیں۔ رب العالمین کا فرمان ہے:

اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْهُوْدًا ○

"نماز قائم کرو سورج کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک اور نمازِ فجر پڑھو، کیونکہ نمازِ فجر فرشتوں کی گواہی کا وقت ہے"۔

آیتِ مجیدہ کی تفسیر

زرارہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے عرض کیا کہ خدا نے کتنی نمازیں فرض کی ہیں؟

آپؑ نے فرمایا: اللہ نے دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔
میں (راوی) نے عرض کیا: کیا اللہ نے ان کا نام رکھا ہے اور اپنی کتاب میں بیان کیا ہے؟
فرمایا: جی ہاں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:
اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ
''نماز قائم کرو ''دلوک شمس'' ''غسق اللیل'' تک۔
''دلوک شمس'' سے سورج کا زوال مراد ہے اور ''غسق اللیل'' سے نصف شب تک وقت مراد ہے۔ پھر اللہ نے فرمایا:
وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا
''اس سے فجر کی نماز مراد ہے اور یہ پانچوں نمازیں ہیں''۔
(فروع کافی، جلد۳/۱۲، طبع کراچی)

علامہ رازی لکھتے ہیں:
هذه الاية توهم ان للظهر والعصر وقتا واحدا وللمغرب والعشاء وقتا واحدا
''یہ آیت اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ ظہر وعصر کا ایک وقت ہے اور مغرب وعشا کا بھی ایک وقت ہے''۔ (تفسیر کبیر، جلد ۴، ص ۳۵۲، طبع مصر۔ درضمن اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ ......)
شاہ ولی اللہ دہلوی کا بیان ہے:
فكانت اوقات الصلاة فى الاصل ثلاثة : الفجر

والعشی وغسق اللیل وھو قولہ تعالیٰ: اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا وانما قال: اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ لان صلاۃ العشی ممتدۃ الیہ حکما لعدم وجود الفصل ولذلك جاز عند الضرورۃ الجمع بین الظھر والعصر وبین المغرب والعشاء فھذا اصل......

''یعنی نماز کے اوقات میں تین ہی ہیں صبح، ظہر اور رات کی تاریکی کا وقت اور قرآن کریم کی آیت: اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا کی آیت کا بھی یہی مفہوم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ۔ اس لیے فرمایا کہ ظہر کی نماز کا وقت غروبِ آفتاب تک پھیلا ہوا ہے، کیونکہ نماز ظہر وعصر کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے اسی وجہ سے ضرورت کے وقت نماز ظہر وعصر اور نماز مغرب وعشاء میں جمع کرنا جائز ہے''۔

شاہ ولی اللہ دہلوی نے تین اوقات تسلیم کیے، لیکن اپنے مذہبی اور فقہی عقیدہ سے مجبور ہو کر یہ لکھا کہ ''ضرورت کے وقت نماز ظہر وعصر اور نماز مغرب وعشاء میں جمع کرنا جائز ہے''۔

آیتِ مجیدہ میں تو اللہ نے کہیں لفظ ''ضرورت'' کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ نہ جانے شاہ ولی اللہ نے یہ لفظ کہاں سے نکال لیا۔ اصل بات یہ ہے کہ انھوں نے لفظ ''ضرورت'' لگا کر قرآن کریم کی آیت کو اپنی فقہ اور اپنے نظریات کے پیچھے

چلانے کی کوشش کی ہے، جب کہ اللہ نے قرآن کو مقتدا بنا کر بھیجا ہے۔ کسی فقہ کا مقتدی بنا کر نہیں بھیجا۔

چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل کی اس آیت کے الفاظ اور مفسرین کی تفاسیر کے تجزیہ کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اوقاتِ نماز کا جو حکم جاری کیا ہے، وہ اوقات دراصل تین ہیں: ① زوالِ آفتاب کے بعد سورج غروب ہونے تک ② سورج غروب ہونے کے بعد رات کے ایک حصہ تک ③ نمازِ فجر۔

واضح رہے کہ پہلے دو اوقات اتنے وسیع ہیں کہ اگر کوئی شخص اس میں انفرادی نماز پڑھے تو وہ بھی قرآن کے دائرے میں رہے گا اور اگر کوئی شخص دو نمازوں کو جمع کر کے پڑھے تو وہ بھی قرآنی آیت کے دائرہ میں ہی رہے گا۔

مذکورہ بالا آیت کے علاوہ بھی کچھ آیات میں اوقاتِ نماز کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ فرمائیں یہ الفاظ ہیں سورۂ مبارکہ ہود (آیہ ۱۱۴) کے۔

وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ۝

"دن کے دونوں کناروں اور رات گئے نماز پڑھا کرو، یقیناً نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں اور ہماری یاد کرنے والوں کے لیے یہ باتیں نصیحت ہیں"۔

یہاں دن کے دونوں کناروں سے مراد دن کا پہلا کنارہ نمازِ فجر اور دوسرا کنارہ نمازِ ظہر وعصر ہے اور "کچھ رات گئے تک" سے مراد نمازِ مغرب وعشاء ہے۔ چنانچہ اس آیۂ مجیدہ میں بھی نماز کے تین ہی اوقات بیان کیے گئے ہیں۔

آیئے مزید تفصیل کے لیے سورۂ ق کی ان آیات مجیدہ کی طرف رجوع

کرتے ہیں:

فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ○ وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ (سورۂ ق:۳۹-۴۰)

"کفار جو باتیں کر رہے ہیں آپؐ ان پر صبر کریں اور آفتاب کے نکلنے سے پہلے (نمازِ فجر) اور غروب سے پہلے (ظہر و عصر) اپنے پروردگار کی تسبیح کریں اور تھوڑی دیر کے لیے رات کو (مغرب و عشاء) اس کی تسبیح کریں اور نماز کے بعد بھی اس کی تسبیح کرو"۔

سورۂ ق کی ان آیاتِ مجیدہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے نمازوں کے تین ہی اوقات بیان کیے ہیں، لہٰذا اب اگر کوئی مسلمان اللہ تعالیٰ کے فرمان کو مدنظر رکھ کر جمع بین الصلاتین کرتے ہوئے تین ہی اوقات میں نماز پڑھے تو آخر اس پر اعتراض کیوں ہے اور اس عمل کو دیکھ کر جبینوں پر سلوٹیں کیوں نمودار ہوتی ہیں؟!

جمع الصلاۃ اور سنتِ رسولؐ

عن ابن عباس قال صلیت وراء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ثمانیا جمیعا وسبعا جمیعا

"حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے آٹھ رکعتیں جمع کر کے پڑھیں اور سات رکعتیں جمع کر کے پڑھیں۔ (صحیح بخاری، جلد اول/۳۰۲،

کتاب مواقیت الصلاۃ، باب ۳۶۸، حدیث ۵۳۲، صحیح مسلم، جلد۲/۲۲۵، کتاب صلاۃ المسافرین، باب جواز الجمع بین الصلاتین، سنن ابی داؤد، جلد اول/۴۵۴، ابواب صلاۃ السفر، باب الجمع بین الصلاتین، حدیث ۱۲۰۱)

محترم قارئین! ہمارے محدثین نے عمل رسولؐ کو معمہ اور چیستان بنا کر پیش کیا ہے۔ آخر اس بات کا مطلب ہے کہ میں نے آٹھ رکعات نماز پڑھی۔ میں نے سات رکعات نماز پڑھی؟!

اصل بات یہ ہے کہ آٹھ رکعات سے ظہر کی چار اور عصر کی چار رکعات مراد ہیں اور سات رکعات سے مغرب کی تین اور عشاء کی چار رکعات مراد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حق میں قوت رکھی ہے، آخرکار انسان کے منہ پر آ ہی جاتا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری کی حسب ذیل حدیث کو ملاحظہ فرمائیں:

حدثنا ابو النعمان قال حدثنا حماد ابن زيد عن عمرو بن دينار عن جابر بن زيد عن ابن عباس ان النبي صلّى بنا بالمدينة سبعا وثمانيا الظهر والعصر والمغرب والعشاء قال ايوب لعله في ليلة مطيرة قال عسى

"جابر بن زید نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ نبی اکرمؐ نے مدینہ منورہ میں نماز پڑھائی تو سات اور آٹھ رکعات نماز پڑھائی، یعنی ظہر، عصر، مغرب اور عشاء۔ ایوب نے کہا کہ شاید وہ بارش والی رات ہوگی؟ جابر نے کہا: ممکن ہے"۔

مندرجہ بالا روایت میں آنحضرتؐ کی جمع بین الصلاتین کی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے، لیکن یہاں بھی ایک وہم کو جنم دینے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ احتمال اُبھارا گیا کہ شاید آنحضرتؐ نے یہ عمل کسی بارش والی رات میں سرانجام دیا ہوگا۔

اگر بالفرض ہم اس احتمال کو مان بھی لیں تو اس میں لیلۃ مطیرۃ یعنی بارش والی رات کا احتمال پیش کیا گیا ہے۔ جب رسولؐ خدا نے ظہر وعصر کی آٹھ رکعات کو دن میں پڑھائی تھیں۔

تاویلات کے پھندوں سے حق و صداقت کو چھپایا نہیں جاتا اور مصنوعی رکاوٹوں سے سورج کو طلوع ہونے سے نہیں روکا جاسکتا۔ چنانچہ حسب ذیل حدیث کا مطالعہ کریں:

عن ابن عباس قال جمع رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم بین الظھر والعصر والمغرب والعشآء بالمدینۃ من غیر خوف ولا مطر فقیل لابن عباس ما اراد الی ذٰلک قال اراد ان لا یحرج امتہ

"حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسولؐ خدا نے جمع کیا ظہر اور عصر کو اور مغرب اور عشاء کو مدینہ میں کسی خوف کے بغیر اور کسی بارش کے بغیر۔ ابن عباسؓ سے پوچھا گیا کہ اس سے آنحضرتؐ کا کیا مقصد تھا؟ اُنھوں نے جواب دیا: آنحضرتؐ چاہتے تھے کہ اُمت کے لیے کوئی حرج اور تکلیف نہ رہے"۔

مقصد یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے دو نمازیں جمع کر کے اپنی اُمت کے لیے آسانی کا دروازہ کھولا، تاکہ اُمت کو کوئی پریشانی نہ ہو۔ (ملاحظہ فرمائیں: سنن

ابوداؤد، جلداول/۲۵۳، ابواب الصلاۃ السفر، باب الجمع بین الصلاتین، حدیث ۱۹۸، طبع لاہور، صحیح مسلم)

عمل صحابہ

① صحیح مسلم میں مرقوم ہے: شفیق کے بیٹے عبداللہ نے کہا کہ ایک دن ہمارے اندر ابن عباسؓ نے وعظ کیا اور جب آفتاب ڈوب گیا اور تارے نکل آئے تو لوگ نماز نماز پکارنے لگے۔ قبیلہ تمیم کا دم نہ لیتا تھا اور نہ ہی باز آتا تھا۔ وہ مسلسل نماز نماز چلائے جا رہا تھا۔ تب ابن عباسؓ نے فرمایا: تیری ماں مرے تو مجھے سنت سکھاتا ہے۔ پھر کہا کہ میں نے رسولؐ اللہ کو دیکھا کہ آپؐ جمع کرتے ظہر وعصر کو اور مغرب وعشاء کو۔

عبداللہ بن شفیق نے کہا کہ میرے دل میں خلش رہی تو میں ابوہریرہ کے پاس گیا اور ان سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ ابن عباسؓ کا قول سچا ہے۔ (صحیح مسلم، جلد۲/ ۲۲۵، کتاب صلاۃ المسافرین، باب جواز الجمع بین الصلاتین فی السفر، مطبوعہ نعمانی کتاب خانہ، لاہور)

② حدثنا العلاء انه دخل على انس بن مالك في داره بالبصرة حين انصرف من الظهر وداره بجنب المسجد فلما دخلنا عليه قال صليتم العصر؟ قلنا انما انصرفنا الساعة الظهر قال فصلوا العصر قال فقمنا فصلينا فلما انصرفنا قال سمعت رسولَ اللهِ يقول تلك صلاة المنافق جلس يرقب صلاة العصر

حتّٰی اذا کانت بین قرنی الشیطان قام فنقر اربعا لا یذکر اللہ عزوجل فیھا الا قلیلا

”علاء بن عبدالرحمٰن سے روایت ہے کہ میں بصرہ میں حضرت انس بن مالک (مشہور صحابی) کے گھر گیا۔ ہم ظہر کی نماز پڑھ کر آئے تھے، جب کہ ان کا گھر مسجد سے بالکل متصل تھا۔ جب ہم ان کے ہاں داخل ہوئے تو انھوں نے ہم سے کہا کہ کیا تم نے نمازِ عصر پڑھ لی ہے؟

ہم نے کہا کہ ہم تو ابھی نمازِ ظہر سے فارغ ہوئے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ عصر کی نماز پڑھ لو۔ ہم اُٹھے اور عصر کی نماز پڑھی۔ جب ہم فرغ ہوئے تو انھوں نے فرمایا کہ میں نے رسولؐ خدا سے سنا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: یہ منافق کی نماز ہے، بیٹھ کر عصر کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ جب سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان پہنچ جاتا ہے تو وہ اُٹھ کر چار چونچیں مارتا ہے اور ان میں اللہ کو بہت ہی کم یاد کرتا ہے“۔ (سنن نسائی، جلداول/۱۹۳، کتاب المواقیت، باب ۳۰۸، حدیث ۵۱۵، طبع کراچی)

۞ حضرت ابوامامہ بن سہل فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم نے عمر بن عبدالعزیز کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھی۔ پھر میں انس بن مالک کے پاس گیا تو وہ عصر کی نماز پڑھ رہے تھے۔ میں نے پوچھا: چچا! آپ کون سی نماز پڑھ رہے ہیں؟ فرمایا: میں عصر کی نماز پڑھ رہا ہوں۔ ہم لوگ اس وقت رسولؐ خدا کے ساتھ عصر کی نماز پڑھا کرتے تھے۔ (صحیح بخاری، جلداول/۲۹۸، کتاب مواقیت الصلاۃ باب وقت العصر،

حدیث ۵۱۹، سنن نسائی جلد اول/۱۹۳، کتاب المواقیت، باب ۳۰۵، حدیث ۵۱۳)

الغرض ان تین روایات سے صحابہ کا عمل بھی واضح ہو جاتا ہے کہ وہ بھی جمع بین الصلاتین کیا کرتے تھے۔

علامہ وحید الزمان کا اعتراف

عنوان ھذا کی پہلی روایت کے ضمن میں اہلحدیث کے مشہور علامہ وحید الزمان صاحب لکھتے ہیں: عبداللہ بن شقیق نے حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کی ہے کہ ہم "رسولؐ خدا کے زمانے میں دو نمازیں جمع کیا کرتے تھے تو اب یہ کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ اس عمل کے ترک کرنے پر اجماع ہے؟ جو چیز آپؐ کے بابرکت زمانے میں صحابہ کرام کا معمول رہی ہو اس کو سارا زمانہ مل کر کیونکر چھڑا سکتا ہے؟

(شرح صحیح مسلم نووی، جلد ۲/ ۲۲۶، مطبوعہ نعمانی کتاب خانہ، لاہور)

علامہ موصوف نے سنن ابی داؤد کی شرح میں جمع الصلاتین کے مسئلہ پر کافی تفصیلی بحث کی ہے۔ چنانچہ علامہ صاحب لکھتے ہیں: "جن لوگوں کے نزدیک جمع صلاتین درست نہیں ہے ان کے دلائل ضعیف ہیں اور جمع جائز رکھنے والوں کے دلائل بہت قوی ہیں"۔

جمع بین الصلاتین کی مخالف احادیث کے بارے میں علامہ موصوف تحریر کرتے ہیں: "ترمذی نے ابن عباسؓ سے جو روایت کیا کہ رسولؐ خدا نے فرمایا: "جو جمع کرے دو نمازوں کو بغیر عذر کے، تو وہ بڑے گناہوں کے دروازوں میں سے ایک دروازے میں گیا"۔

اس کی اسناد میں حنش بن قیس راوی ضعیف ہے۔ ابن جوزی نے اس

حدیث کو موضوعات میں ذکر کیا ہے اور وہ ان صحیح حدیثوں کے معارض نہیں ہو سکتی جن سے جمع کرنا ثابت ہوتا ہے بغیر سفر اور بغیر خوف اور بغیر بارش کے۔

بعضوں نے یہ تاویل کی ہے کہ شاید یہ مرض کے سبب سے کی ہو۔ امام نووی نے اس تاویل کو قوی کہا ہے، لیکن اگر سچ پوچھو تو یہ تاویل بھی غلط ہے۔ اس واسطے کہ اگر مرض تھا تو آنحضرتؐ کو ہوگا۔ صحابہ کرام کو نہیں۔ دوسرے یہ کہ ابن عباسؓ کا یہ کہنا کہ "میری اُمت کو تکلیف نہ ہو" مرض والی تاویل کے صریح منافی ہے اور ابن مسعود سے جو مروی ہے کہ انھوں نے آنحضرتؐ کو جمع کرتے نہیں دیکھا سوائے مزدلفہ کے، تو یہ شہادت نفی پر ہے اور وہ مقبول نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ ابن مسعود سے کہ رسولؐ خدا نے جمع کیا ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کو، لوگوں نے اس باب میں آپؐ سے کہا تو آپؐ نے فرمایا: میں نے یہ اس واسطے کیا تا کہ میری اُمت کو تکلیف نہ ہو"۔ (شرح سنن ابی داؤد، جلد اول/۴۵۳ در ذیل حدیث ۱۱۹۸، مطبوعہ اسلامی اکادمی، لاہور)

امام مالک نے مؤطا میں جمع بین الصلاتین کی سات احادیث نقل کی ہیں اور مؤطا کی چوتھی حدیث میں ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ رسول اکرمؐ نے ظہر وعصر اور مغرب وعشاء جمع کر کے پڑھی نہ تو کوئی خوف تھا اور نہ ہی سفر درپیش تھا"۔

امام مالک نے کہا: میرا خیال یہ ہے کہ بارش ہو رہی ہوگی۔

مندرجہ بالا روایت کے ضمن میں علامہ وحید الزمان نے یہ کلمات رقم فرمائے:

"یہ خیال امام مالک کا صحیح نہیں ہو سکتا، کیونکہ صحیح مسلم اور اصحاب سنن کی روایت میں "غیر خوف ولامطر" موجود ہے۔

یہی حدیث دلیل ہے محققین اہل حدیث کی اس باب میں کہ

جمع کرنا ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کا حضر میں حاجت دینیہ یا دنیویہ کے لیے درست ہے، اگرچہ ائمہ اربعہ اس کے خلاف ہیں پھر جب حدیث صحیح موجود ہو تو خلاف ائمہ اربعہ بلکہ سارے جہان کے ائمہ اور علماء کا ضرر نہیں کرتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطا نہیں ہو سکتی اور سارے جہان کے مولوی اور علماء خطا کر سکتے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس کے خلاف میں جو استدلال کیا ہے اس حدیث سے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ جس شخص نے جمع کیا دو نمازوں میں سو اُس نے ایک کبیرہ گناہ کیا۔ روایت کیا اس کو ترمذی نے۔
جواب اس کا یہ ہے کہ یہ استدلال بالکل نادرست ہے، کیونکہ یہ حدیث ضعیف ہے بہ اجماع محدثین پھر کیونکر معارض ہوگی حدیث صحیح سے؟" (موطا امام مالک، اُردو ترجمہ، ص ۱۲۴-۱۲۵ مطبوعہ اسلامی اکادمی، لاہور)

ہم علامہ وحید الزمان کی جرأت مردانہ پر انھیں آفرین کہتے ہیں۔ کم از کم انھوں نے حق بات کہنے کی جرأت تو کی تھی، لیکن وہ مرحوم بھی اپنے گردو پیش اور ماحول سے اتنے خوف زدہ تھے کہ وہ عملی طور پر اُسے جاری نہیں کر سکتے تھے۔

فاضل اجل علامہ محمد معین سندھی نے اپنی کتاب دراسات اللبیب فی الاسوۃ الحسنۃ بالحبیب کے الدراسۃ السابعہ میں یہ عنوان قائم کیا ہے کہ جب کوئی حدیث اربعہ کی فقہ کے خلاف ہو تو پھر کیا کرنا چاہیے؟

اس پورے باب میں اُنھوں نے حدیث جمع بین الصلاتین کو اپنا عنوان

قرار دیا اور یہ کہا کہ ائمہ اربعہ نے آج تک اس حدیث پر عمل نہیں کیا تو کیا ہمیں ائمہ اربعہ کی پیروی کرنی چاہیے یا حدیث کی؟

انھوں نے پورے علمی دلائل سے واضح فرمایا کہ ائمہ اربعہ کا قول حجت نہیں ہے جب کہ حدیثِ رسولؐ حجت ہے۔

اللہ نے رسولؐ کو مقتدا بنا کر بھیجا ہے۔ ائمہ اربعہ کی اقتداء کا حکم نہ تو خدا نے فرمایا ہے اور نہ ہی رسولِ خدا نے دیا ہے، لہٰذا حدیث رسولؐ کے سامنے آئمہ اربعہ کے اقوال کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ سنن ترمذی کے ٹائٹل پیج پر یہ جملہ لکھا ہے:

کل احادیث الترمذی معمول بها عند العلماء ما خلا حدیثین حدیث الجمع وحدیث شارب الخمر

"سنن ترمذی میں جتنی بھی روایات ہیں ان سب پر علماء نے عمل کیا ہے، البتہ دو احادیث ایسی ہیں جن پر علماء نے عمل نہیں کیا، جن میں سے ایک جمع بین الصلاتین کی حدیث ہے اور دوسری شرابی کی سزا کی حدیث ہے"۔

ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جمع بین الصلاتین کی حدیث صحیح ہے۔ رسولؐ اسلام نے دو نمازیں جمع کر کے پڑھائی تھیں۔ یہ عمل سنتِ رسولؐ ہے لیکن علمائے اُمت اور فقہائے اُمت نے اس پر عمل نہیں کیا۔ اور یوں سنتِ رسولؐ عملی طور پر مُردہ ہو چکی ہے اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ جو بھی مسلمان میری مُردہ سنت پر عمل کر کے اُسے زندہ رکھے تو اللہ تعالیٰ اُسے ثوابِ عظیم عطا کرے گا۔

شیعانِ حیدر کرارؑ نے دیکھا کہ اُمت نے مجموعی طور پر ائمہ اربعہ کی تقلید کا

قلادہ اپنے گلے میں ڈال رکھا ہے اور ائمہ اربعہ نے سنتِ رسول کو مُردہ بنا دیا ہے۔
اسی لیے آلِ محمدؑ کے پیروکاروں نے جمع بین الصلاتین پر عمل کیا ہے، تاکہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی سنت مُردہ نہ ہونے پائے۔

اس طرح سے شیعانِ اہلِ بیتؑ کی نمازیں بھی ہو جاتی ہیں اور انھیں احیائے سنت کا اضافی ثواب بھی ملتا ہے۔

***

باب سیزدہم

نمازِ جنازہ

ہر بالغ مسلمان پر نمازِ جنازہ پڑھنا فرضِ کفایہ ہے۔ چھے سال سے کم عمر بچوں کا جنازہ پڑھنا مستحب ہے۔ اُمت اسلامیہ کی بدنصیبی کہیے یا اسے اور کوئی نام دیجیے کہ مسلمان نمازِ جنازہ کی تکبیرات پر بھی متفق نہیں ہیں۔

برادرانِ تسنن چار تکبیرات پڑھتے ہیں، جب کہ مسلکِ اہلِ بیتؑ سے وابستہ افراد پانچ تکبیرات ادا کرتے ہیں، لیکن یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ برادرانِ تسنن جب نمازِ جنازہ پڑھتے ہیں تو امام صاحب بلند آواز سے نیت کرتا ہے جب کہ باقی تمام جنازہ دل میں پڑھتا ہے صرف اللہ اکبر بلند آواز سے کہتا ہے۔ خدا جانے وہ بلند آواز سے نمازِ جنازہ کیوں نہیں پڑھتا۔ ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ وہ اپنے مقتدیوں سے شرمندگی محسوس کرتا ہے، کیونکہ وہ نیت کچھ اور کرتا ہے اور عمل کچھ اور کرتا ہے۔

اگر آپ نے نیت اور عمل کے تضاد کو ملاحظہ کرنا ہو تو آپ نمازِ جنازہ کی دعاؤں سے اس کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

سُنّی نمازِ جنازہ

امام صاحب بلند آواز سے نیت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "پڑھتا ہوں میں نماز طرف قبلہ کے، ثنا اللہ تعالیٰ کی   اُ   محمد مصطفیٰؐ کے   واسطے دعا بخشش

اس حاضر میت کے۔

اس کے بعد وہ اللہ اکبر کہتا ہے، یوں پہلی تکبیر مکمل ہو جاتی ہے۔

آیئے دیکھیں کہ امام صاحب نے تمام مسلمانوں کی موجودگی میں خدا سے جو عہد کیا تھا کیا اس نے وہ عہد پورا بھی کیا یا نہیں؟

بنیادی وعدے تین ہیں: پہلا وعدہ ہے کہ اللہ کی ثنا کروں گا۔ دوسرا وعدہ ہے کہ حبیبؐ خدا پر درود بھیجوں گا اور تیسرا وعدہ ہے کہ میں اس حاضر میت کی بخشش کی دعا کروں گا۔

نیت کے بعد وہ پہلی تکبیر کہتا ہے۔ پھر وہ سبحانك اللهم وبحمدك...... پڑھتا ہے۔ چنانچہ وہ ثنائے پروردگار کر کے اپنے پہلے وعدہ کو پورا کرتا ہے۔ پھر "اللہ اکبر" کہہ کر تیسری تکبیر کی دعا شروع کرتا ہے اور اس میں درود ابراہیمی پڑھتا ہے، پھر اللہ اکبر کہتا ہے۔

یوں امام صاحب اپنے دوسرے وعدہ یعنی درود پڑھنے کے وعدہ کو پورا کرتا ہے۔ اب تین میں سے دو وعدے پورے ہو گئے ہیں۔ اب آخر میں صرف ایک وعدہ باقی ہے اور وہ یہ کہ میں اس حاضر میت کے لیے دعائے مغفرت کروں گا۔

آیئے دیکھیں کہ امام صاحب حاضر میت کی بخشش کی دعا کس طرح سے کرتے ہیں؟!

اب امام صاحب یہ دعا پڑھتے ہیں:

اللهم اغفر لحينا وميتنا وشاهدنا وغائبنا وصغيرنا وكبيرنا وذكرنا انثانا......

"پروردگارا! ہمارے زندوں کو بخش، ہمارے مُردوں کو بخش اور

جو یہاں موجود ہیں انھیں بخش اور جو یہاں سے غائب ہیں
اُنھیں بخش۔

خدایا! ہمارے چھوٹوں کو بخش، ہمارے بڑوں کو بخش، ہمارے
مُردوں کو بخش اور ہماری عورتوں کو بخش۔

خدایا! جب تک زندہ رکھے تو اسلام و ایمان پر زندہ رکھنا اور
جب تو ہم میں سے کسی کو موت دے تو بھی اسلام و ایمان پر
موت دینا"۔

اس کے بعد امام صاحب سلام پھیر دیتا ہے۔

قارئین کرام! یہ جنازہ ہمارا ہرگز خودساختہ نہیں ہے۔ کسی بھی نماز حنفی کے کتابچہ کو اُٹھا کر پڑھیں۔ آپ کو یہی نمازِ جنازہ لکھا ہوا دکھائی دے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ امام نے تمام مسلمانوں کی موجودگی میں خدا سے تین وعدے کیے تھے کہ تیری ثنا کروں گا۔ چنانچہ اس نے ثنا کر دی۔ پہلا وعدہ پورا ہوا۔ دوسرا وعدہ کیا تھا کہ رسولؐ خدا پر درود بھیجوں گا۔ چنانچہ آنحضرتؐ پر درود بھیجا جس سے دوسرا وعدہ بھی پورا ہو گیا اور تیسرا وعدہ تھا کہ میں حاضر میت کی بخشش کے لیے دعا کروں گا۔ جب کہ امام نے اپنے زندہ، مُردے، حاضر و غائب، صغیر و کبیر اور مرد و عورت کی بخشش کے لیے تو خدا سے درخواست کی، لیکن حاضر میت کی بخشش کے لیے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکالا!! خدارا ہمیں سمجھایا جائے کہ آخر مرنے والے کا کیا جرم تھا جس کی بخشش کے لیے نہ تو امام نے ایک لفظ کہا اور نہ ہی کسی مقتدی نے ایک لفظ کہا؟!

کیا مرنے والا اتنا استحقاق بھی نہیں رکھتا کہ اس کی بخشش کے لیے خود اس

کی نماز جنازہ میں ایک حرف کہہ دیا جائے۔

میں سمجھتا ہوں کہ حقیقی وارثانِ دین سے انحراف کی یہ پہلی سزا ہے کہ بظاہر جنازہ اسی کا پڑھا جا رہا ہے، لیکن اس کے اپنے ہی جنازے میں اس کی بخشش کے لیے ایک بھی حرف موجود نہیں ہے۔

شیعہ نماز جنازہ

آیئے بطور تقابل مسلکِ شیعہ میں پڑھے جانے والی نماز جنازہ پر بھی نگاہ ڈال لیں اور پھر فیصلہ کریں کہ مرنے والے کی بخشش کی دعا کس مسلک میں موجود ہے اور کس مسلک میں موجود نہیں ہے۔

شیعہ پیش نماز (امام) نیت کرتا ہے کہ میں پانچ تکبیر نماز جنازہ پڑھ رہا ہوں حاضر میت کا۔ واجب قُرْبَۃً اِلَی اللّٰہِ۔ پھر وہ اللہ اکبر کہتا ہے اور یوں پہلی تکبیر مکمل ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد وہ کلمہ شہادت پڑھتا ہے یعنی وہ توحید و نبوت کی گواہی دیتا ہے:

> اشهد ان لا اله الا الله وحدهٗ لا شريك له واشهد ان محمدًا عبدهٗ ورسوله ارسله بالحق بشيرا ونذيرا بين يدى الساعة۔
>
> "یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اور وہ واحدہٗ لاشریک ہے اور میں یہ گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمدؐ اللہ کے عبد ہیں اور اُس کے رسولؐ ہیں خدا نے انھیں حق کے ساتھ بشیر و نذیر بنا کر قیامت تک کے لیے بھیجا ہے"۔

اس کے بعد امام صاحب تکبیر کہتا ہے: یوں دو تکبیریں مکمل ہو جاتی ہیں پھر امام صاحب درودِ ابراہیمی پڑھتا ہے اور اس کے آخر میں اللہ اکبر کہتا ہے: یوں تین تکبیریں پوری ہو جاتی ہیں: پھر امام صاحب اہلِ ایمان و اسلام کی عمومی مغفرت کی دعا مانگتا ہے اور کہتا ہے:

اللھم اغفر للمؤمنین والمؤمنات والمسلمین والمسلمات الاحیاء منھم والاموات تابع اللھم بیننا وبینھم بالخیرات انك مجیب الدعوات انك علٰی کُل شئی قدیر

"خدایا! اہلِ ایمان مردوں اور اہلِ ایمان عورتوں اور اہلِ اسلام مردوں اور اہلِ اسلام عورتوں کی بخشش فرما۔ خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ اور ہمارے ان کے درمیان بھلائی کے تعلقات جاری رکھ۔ بے شک تو دعاؤں کے قبول کرنے والا ہے، بے شک تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"۔

اس تکبیر میں عمومی دعا کی جاتی ہے، پھر امام صاحب اللہ اکبر کہتا ہے، اس کے بعد پانچویں تکبیر کی دعا پڑھتا ہے، جو کہ مرنے والے کی بخشش سے تعلق رکھتی ہے، چنانچہ امام صاحب کہتا ہے:

اللھم ان ھذا عبدك و ابن عبدك و ابن امتك نزل بك وانت خیر منزل بہ اللھم لا نعلم منہ الا خیرا وانت اعلم بہ منا اللھم ان کان محسنا فزد فی احسانہ وان کان مسیئا مذنبا فتجاوز عن سیئاتہ

واحشره مع النبي والائمة الطاهرين برحمتك يا ارحم الراحمين

"خدایا! یقیناً یہ تیرا بندہ ہے اور تیرے بندے کا فرزند ہے اور تیری کنیز کا بیٹا ہے، اب یہ تیرا ایمان ہے اور تو بہترین مہمان نواز ہے۔ خدایا! ہمیں اس کی بھلائی کے علاوہ اور کچھ معلوم نہیں ہے اور تو اُسے ہم سے بہتر جانتا ہے۔

خدایا! اگر یہ نیکوکار تھا تو اس کی نیکیوں میں اضافہ فرما اور اگر یہ گناہ گار اور بدکار تھا تو اس کی غلطیوں سے درگزر فرما، اے نبی اکرمؐ اور ائمہ طاہرینؑ کے ساتھ بروزِ قیامت محشور فرما۔

اے ارحم الراحمین! تجھے تیری رحمت کا واسطہ ہماری دعا قبول فرما!"

اس کے بعد "اللہ اکبر" کہہ کر امام صاحب پانچویں تکبیر مکمل کرتا ہے۔

قارئین کرام! دونوں مسالک کے جنازے کی دعاؤں کو ہم نے بلاکم و کاست نقل کیا ہے۔ اب خود ہی انصاف کر کے فیصلہ کریں کہ کیا اہلِ تسنن برادران کے نمازِ جنازہ میں مُردہ کے لیے دعا کی جاتی ہے یا نہیں؟

ہمیں ہر اہلِ انصاف بھائی سے توقع ہے کہ وہ کہے گا: نہیں اس میں تو مرنے والے کے لیے ایک لفظ تک موجود نہیں ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ امام صاحب شرمندگی چھپانے کے لیے جنازہ کی دعاؤں کو بلند آواز سے نہیں پڑھتے، جب کہ شیعہ مذہب میں مرنے والے کے لیے دعا موجود ہے اسی لیے وہ شرمندہ نہیں ہوتے اور نمازِ جنازہ کو بلند آواز سے پڑھتے ہیں۔

پانچ تکبیرات اور کتب اہل سنت

ملاحظہ فرمائیں:

عن عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ قال کان زید بن ارقم یکبر علی جنائزنا اربعا وانہ کبر علی جنازۃ خمسا فسألناہ عن ذٰلک فقال کان رسول اللّٰہ (ص) یکبرھا قال ابوعیسیٰ حدیث زید بن ارقم حدیث حسن صحیح وقد ذھب بعض اھل العلم الی ھذا من اصحاب النبی وغیرھم ورأوا التکبیر علی الجنازۃ خمسا وقال فانہ یتبع الامام عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ......

"عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ صحابی رسولؐ حضرت زید بن ارقم ہمارے جنازوں پر چار تکبیریں کہا کرتے تھے اور ایک جنازہ پر آپ نے پانچ تکبیریں پڑھیں۔ ہم نے ان سے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پانچ تکبیریں کہا کرتے تھے: امام ابوعیسیٰ ترمذی کہتے ہیں کہ زید بن ارقم کی حدیث حسن صحیح ہے۔ بعض صحابہ کرام اور علما کا یہی مسلک ہے کہ نماز جنازہ کی پانچ تکبیریں ہیں۔

امام احمد اور امام اسحاق کہتے ہیں کہ اگر امام جنازہ پر پانچ تکبیریں کہے تو اس کی اتباع کی جائے"۔

(جامع ترمذی، جلد اول، ابواب الجنائز، باب ۳۵۲، ماجاء فیمن کبر خمسا، حدیث ۱۵۲۶۔ سنن نسائی، کتاب الجنائز، باب عدد

التکبیر علی الجنازۃ، ص ۲۱۳۔ اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ، کتاب الجنائز، باب المشی بالجنازۃ والصلاۃ علیھا، الفصل الاول، حدیث ۱۵۶۴-۸۔ تعطیر الشام، طبع لاہور۔ تعطیر الشام، طبع لاہور، ص ۱۰۰ بحوالہ مسلم۔ صحیح مسلم، کتاب الجنائز، حدیث ۱۵۶۳

چار تکبیرات کب سے رائج ہوئیں؟

شاہ ولی اللہ دہلوی حجۃ اللہ البالغہ (جلد دوم/۵۵۰) پر لکھتے ہیں:

ھذا ما تقرر فی زمان عمر...... وان کانت الاحادیث مخالفۃ فی الباب

"چار تکبیرات پر حضرت عمر نے لوگوں کا اجماع کر دیا تھا، اگرچہ تکبیراتِ جنازہ کے متعلق احادیث اس کی مخالف ہیں"۔

علامہ شبلی نعمانی جو کہ برصغیر میں حضرت خلیفہ ثانی کے وکیل تھے، انھوں نے اپنی کتاب "الفاروق" کے آخر میں "اولیاتِ عمر" کے عنوان سے ایک باب قائم کیا اور شبلی لکھتے ہیں کہ "اولیاتِ عمر" سے وہ چیزیں مراد ہیں جنھیں حضرت عمر نے ایجاد کیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ۴۰ ویں نمبر پر لکھا۔ نمازِ جنازہ میں چار تکبیروں پر تمام لوگوں کا اجماع کر دیا۔

احمد دہلوی شرح بلوغ المرام، ص ۲۰۱ پر لکھتے ہیں کہ حضرت عمر نے صحابہ کو اکٹھا کیا اور انھیں نمازِ جنازہ کی چار تکبیروں پر جمع کیا۔

علامہ جلال الدین سیوطی اولیاتِ عمر کے ضمن میں لکھتے ہیں:

اول من حرم المتعۃ...... واول من جمع الناس فی صلاۃ الجنائز علی اربع تکبیرات

حضرت عمر پہلے شخص تھے جنھوں نے متعہ کو حرام کیا...... اور وہ پہلے شخص تھے ......جنھوں نے لوگوں کو نماز جنازہ میں چار تکبیروں پر جمع کیا"۔ (ملاحظہ فرمائیں، تاریخ الخلفاء، مطبوعہ، مطبع مجتبائی، ۱۹۱۰ء، ص ۱۹۷)

تکبیراتِ جنازہ اور ائمہ اہلِ بیتؑ

عن جعفر بن محمد علیهما السلام انه سئل عن التكبير على الجنائز؟ فقال خمس تكبيرات اخذ ذلك من الصلاة الخمس من كل صلاة التكبيرة

"حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے نماز جنازہ کی تکبیروں کے متعلق پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا: نماز جنازہ کی پانچ تکبیریں ہیں جو کہ پنجگانہ نمازوں سے لی گئی ہیں۔ نمازیں پانچ ہیں اور ہر نماز سے ایک تکبیر لی گئی ہے اور یوں پانچ تکبیریں جنازہ میں شامل ہیں"۔

یہ حدیث علل الشرائع کے باب ۲۳۴-۲۳۵ میں بھی مذکور ہے۔

قارئین کرام! باتیں تو بہت زیادہ تھیں، لیکن اختصار کے پیش نظر ہم نے صرف انھی معروضات پر اکتفا کیا ہے اور ہم اپنے تمام انصاف پسند قارئین سے التماس کرتے ہیں کہ مسلکی تعصب کی عینک ہٹا کر ان صفحات کا مطالعہ فرمائیں، امید واثق ہے کہ انھیں صلواۃ الرسول کے خدوخال دکھائی دیں گے۔

***

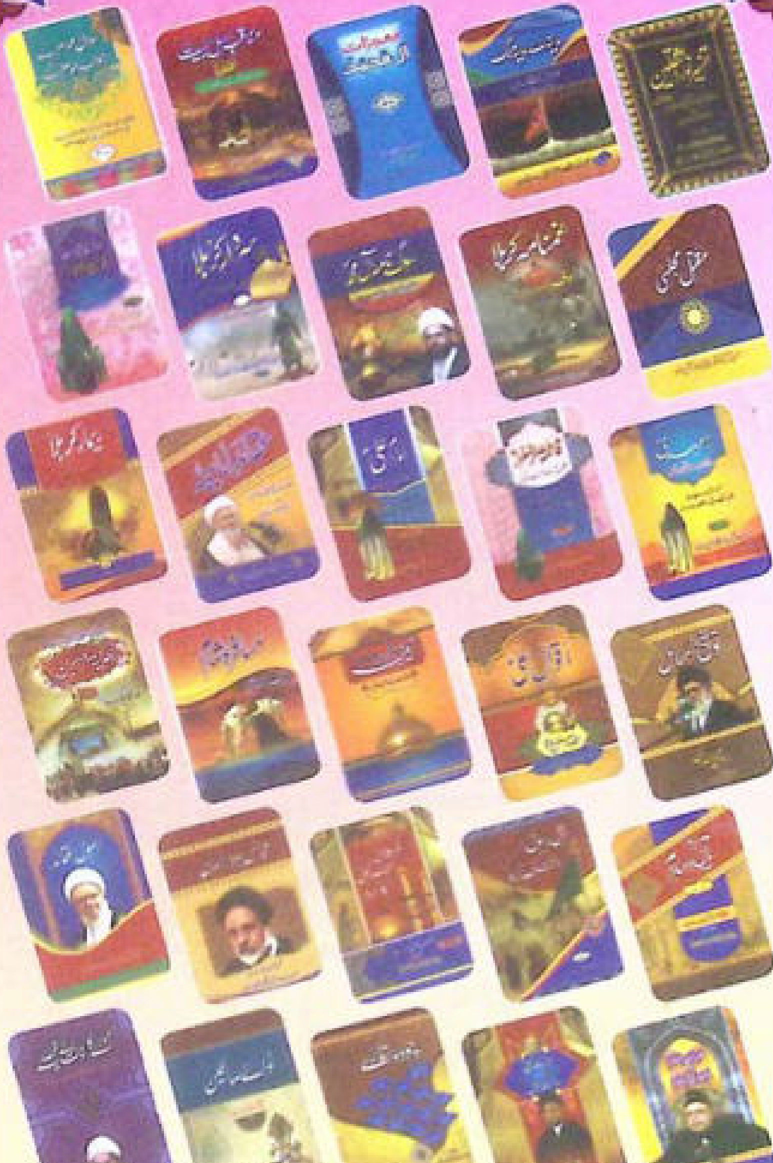

ادارہ منہاج الصالحین
الحمد مارکیٹ فرسٹ فلور، دکان نمبر 20، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور
فون: 042-37225252 ، 0301-4575120